آج کے شہید

سمپادک

رتن لال بنسل

چھپوانے والے۔

سکریٹری ہندستانی کلچر سوسائٹی

۴۸، بائی کا باغ، الہ آباد

، جلد] سنہ ۱۹۴۹ء [قیمت ڈھائی روپیہ

سیلمی برقی پریس الہ آباد

کہاں کیا؟

بہن امت السلام

بہن امت السلام پٹیالہ ریاست (پنجاب) کے ایک مشہور مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئیں مگر اپنے خاندانی سکھوں کو ٹھکرا کر وہ ۱۹۳۰ میں گاندھی جی کے آشرم میں آ گئیں اور تبھی سے گاندھی جی کے آدرشوں اور عقیدوں کے انوسار اپنا جیون ڈھالنے لگی ہیں۔

بہن امت السلام پر بچپن سے ہی تھیاسافی کا اثر پڑا ہے اور اسلئے وہ ہر مذہب کی ایک سی عزت کرتی ہیں۔ گیتا اور انجیل کی بھی انکے دل میں وہی عزت ہے جو پکی مسلمان ہونے کے ناطے قرآن کی ہے۔ روزے، نماز کی وہ سختی سے پابند ہیں پر گیتا پاٹھ بھی باقاعدہ کرتی ہیں۔

ہندو مسلم ایکتا کو انھوں نے اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد بنا لیا ہے۔ ۱۹۴۲ میں اسکے لئے انھوں نے "اتحاد" نام کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا تھا۔

۱۹۴۷ میں جب نواکھالی میں فرقہ وارانہ دنگے شروع ہوئے تو بہن امت السلام کام کرنے کے لئے وہاں بھی پہنچ گئیں۔ سرندی نام کے گاؤں میں انھوں نے ایکتا ایسی حالت میں اپواس شروع کر دیا جبکہ انھیں ۱۰۴ ڈگری بخار بھی تھا۔ جن کے سرندی پہنچنے پر اور آس پاس کے دیہاتوں کے مسلمانوں کے یہ وعدہ کرنے پر کہ اب کبھی اُن کے ذریعے ہندوؤں کو نقصان نہ پہنچے گا، انھوں نے پچیسویں دن برت توڑ دیا۔

پنجاب میں دنگا ہونے پر امت السلام بہن پنجاب میں بھگائی ہوئی ہندو سکھ بہنوں کو انکے گھر پہنچانے میں لگ گئیں۔ ریاست بہاولپور میں اس سلسلے میں بھی انھیں اپواس کرنا پڑا تھا۔

آج بھی آپ پنجاب کی ابلاؤں اور دکھیاری بہنوں کے ادھار کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔

سمرپن

ہندو مسلم ایکتا کے پنتھ کی سچی جو

بہن امت السلام کے چرنوں میں ، جنھوں نے نواکھالی کے
ہندوؤں کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی
تھی اور جو آج بھی دین دکھی شرنارتھی
بھائی بہنوں کی سیوا کرتی ہوئی گھر
گھر پریم کا الکھ جگاتی پھر
رہی ہیں

—— سمپادک



بہن امت السلام
نواکھالی میں ہندو مسلم ایکتا کے سلسلے میں رکھے گئے اُپواس کے پچیسویں دن گاندھی جی کے ہاتھوں سے

ایک بات

کتاب کا نام اور اوپر کی ٹیپ ٹاپ گاہک کو کھینچتی ہے۔ وہ خریدنے کے لئے اسے اٹھاتا بھی ہے پر دام نکالنے سے پہلے ایک پنّا اُلٹتا ہی ہے۔ اس کتاب کا پہلا پنّا ایسا تھا کہ گاہک سمجھ جاتا کہ کتاب کس طرح کی ہے۔ میں ایک پنّا اور لکھ کر گاہک کو بے مطلب دو پنّا الٹنے کے لئے مجبور کر رہا ہوں۔ کتاب خود کافی بولتی ہے، میں تو رولنج پیدا کر رہا ہوں۔

دیش کی خاطر لڑائی کے میدان میں جان دے دینا، میرے خیال میں کچھ آسان ہے، کیونکہ لڑائی میں لڑ مرنے والے سپاہی کا خون گرم ہوتا ہے۔ وہ بدلا لینے کے جوش میں اپنے تن کی سُدھ بھول جاتا ہے۔ پھر تن کا کیا رہنا اور کیا نہ رہنا۔ ستیہ گرہ میں دیش کی خاطر ٹھنڈے خون والے بھی ہتھیلی پر جان لئے پھرتے ہیں پر اُنھیں بھی دیش کی آزادی کے بعد ٹھنڈی چھاتی ہو جانے کی آشا رہتی ہے اسلئے وہ بھی تن کی سدھ بھول سکتے ہیں اور جان کی بازی لگا سکتے ہیں اس کتاب میں شہیدوں کا ہی ذکر ہے پر دن کی آزادی کے شہیدوں کا نہیں۔ اس میں ذکر ہے ان شہیدوں کا جو انسانی پریم سے کھاپہ کر ذرہ ذرہ کر اپنی بلی دیتے ہیں۔ جان چلی جائے تو جائے۔

اس کتاب میں بلیدانوں کا ایک ایسا سلسلہ ملیگا جس میں ساتھ بھگت لئے ڈھال سینے کی کوشش کی ہے تلوار سہنے کی نہیں۔ زرہ بکتر سینے

کی کوشش کی ہے. طمنچہ بننے کی نہیں. سماج کے دو دل روپی ڈیوں
کے بیچ ٹکر بن کر بیچ کر مرتے ہیں اُس نے اپنا اور سماج کا بھلا سوچا
ہے۔ فرقہ داریت کے بھڑکانے ہیں نہیں. یہ کتاب کیا ہے سچے دھرماتماؤں
کی جیون کہانی ہے یا سچے سادھوؤں کی پاک کتھا ہے. یہی وہ لوگ تھے
جو سمجھتے تھے کہ رام، رحیم، اللہ، ایشور، ایک ہی پرماتما کے نام ہیں،
اور یہ کہ دنیا کے سب لوگ اُسی ایک کے بندے ہیں اور اس ناتے بھائی
بھائی ہیں، ان میں لڑائی کیسی. یہ دونوں ایک جان ہونے چاہئیں
یہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان یا یہ ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی. یہ نہ بنگالی
تھے نہ مدراسی، نہ پنجابی اور نہ گجراتی. یا یہ کہ یہ سب کچھ تھے یعنی ہندستانی
تھے. بس یہ انسان تھے یا انسان کی شکل میں دیوتا تھے.

یہ مہاپرش تھے اور وہ پوجا کے حق دار ہیں.

آدمی کے اچھے پن کو دھونے میں یہ کتاب گنگا جل کا کام دیگی.

نئی دلی
۱-۱-۴۹

بھگوان دین

سمپادک کا نویدن

یہ کتاب آج کے شہید، جیسی بھی بن پڑی ہے، پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔
اس کتاب کو نکالنے کا اصل منشا صرف یہ ہے کہ آج، جبکہ فرقہ پرستی کے زہر میں ڈوبے ہونے کی وجہ سے ہم انسانیت کو بھی بھول چکے ہیں، تب اپنے اُن شہیدوں کی یاد تازہ کر لیں، جنھوں نے انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی قیمتی جانیں دیں اور ہندو، سکھ و اسلام مذہب کے نام پہ لگے ہوئے کلنک کو اپنے خون سے دھو کر اسکی عظمت کو قائم رکھا۔ ان شہیدوں کی یاد ہماری انسانیت کو ابھارے گی اور اُبھری ہوئی موجودہ حیوانیت کو دبائے گی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس کتاب کے تیار کرنے میں آنریبل کیلاش ناتھ کاٹجو گورنر پچھمی بنگال، بہن شکنتلا چنتامنی (کلکتہ)، بہن گیان کماری ہیڈا (حیدرآباد) نے اپنے لیکھوں کے ساتھ ساتھ دوسرے شہیدوں کی جانکاری بھیجکر اور شری گنگا پرشاد 'نازک' الہ آبادی، بھائی اوم پرکاش پالیوال فیروزآباد، شری ہریشچندر جین فیروزآباد و شری جنیندر کوشک نے دوسری زبانوں کے لیکھوں کا ترجمہ کر کے، و اسی طرح کے دوسرے کام کر کے جو مدد کی ہے اس کے لئے میں بہت ہی احسان مند ہوں۔

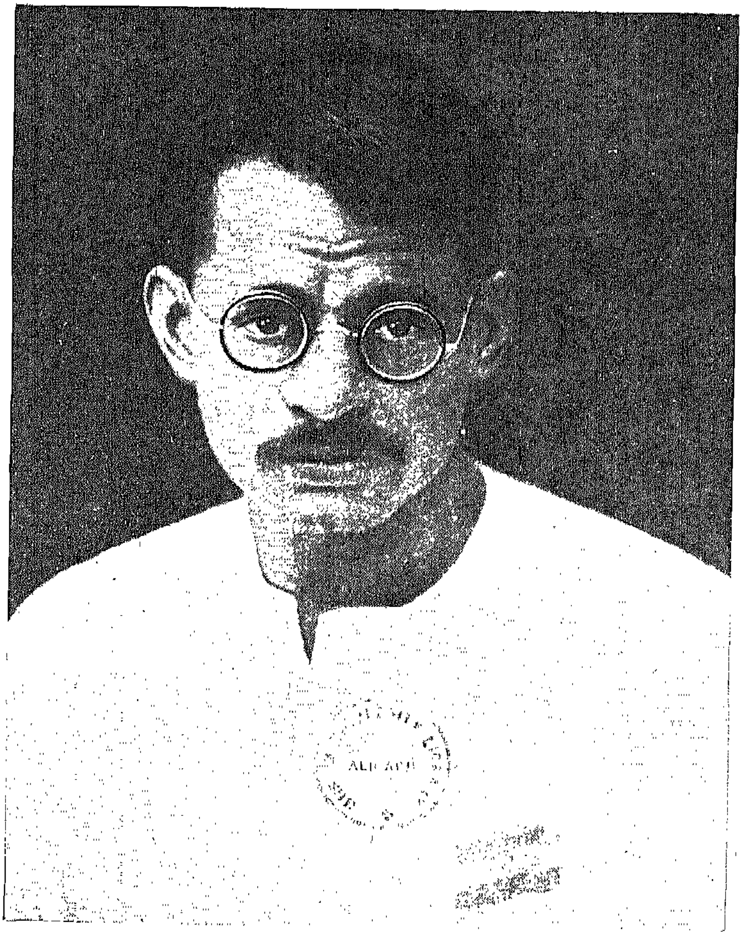
کتاب نکالنے میں ہندستانی کلچر سوسائٹی کے کاریہ کرتاؤں نے اور "دنیا ہند" کے بھائی ہنر صاحب نے بھاری محنت کی ہے۔ ہنر صاحب کو تو میرے لیکھوں میں جگہ جگہ سدھار بھی کرنا پڑا ہے، اسلئے پڑھنے والوں کو کتاب کا اصل سمپادک بھائی ہنر صاحب کو ہی سمجھنا چاہیئے۔

کتاب میں جن بھائی بہنوں کے لیکھ ہیں، اُنکے لئے تو میرا دھنیہ واد ہے ہی۔ آشا ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے بھائی کتاب کے بارے میں اپنی رائے اور سجھاؤ لکھ بھیجنے کی کرپا کریں گے، جس سے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکالتے وقت اُن سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

رتن لال بنسل
سمپادک

وجے گڑھ (علی گڑھ)
تاریخ ۲۷-۱-۴۹

آج کے شہید



شري گنیش شنکر ودیارتھي

شری گنیش شنکر ودیارتھی

اُس دن کانپور میں جیسے آگ برس رہی تھی۔

"اللہ اکبر" "ہر ہر مہادیو" "بجرنگ بلی کی جے" جیسے پوتر نعروں کے ساتھ انسانیت کا دامن چاک چاک کیا جا رہا تھا۔ گھروں میں عورتیں سسک رہی تھیں، بچّے سہمے ہوئے تھے اور بیمار و بے بس لوگ گھبرا رہے تھے۔

آج ہندوؤں کو 'ہندو دھرم' کی اور مسلمانوں کو 'اسلام' کی یاد جو آگئی تھی۔

رام اور کرشن کے انویائی آج دودھ مُنہے بچوں پر اپنی تلواریں آزما رہے تھے اور حضرت محمد کے پیرو بیمار اور بے بسوں کو زندہ جلا کر 'اسلام' کا نام روشن کر رہے تھے۔ جو پاپ اور ظلم آدمی اپنی خود غرضی کے لیے نہیں کر سکتا، وہ سب 'دھرم' اور 'دین' کے نام پر ہو رہے تھے اور جو یہ نہیں کر سکتے تھے یا ان کو کرنے سے منع کرتے تھے، وہ اپنی قوم کے غدّار تھے، کایر تھے، اُنکو اپنے

مذہب کا خیال ہی نہیں تھا۔

گنڈوں کی بن آئی تھی، کیوں کہ آج وہ اپنی قوم کے 'ہیرو' تھے۔ اگر عبداللہ اپنے پڑوسی گوری کی لڑکی کو لے کر بھاگ گیا تھا، یا اُس نے گوری کی لڑکی کو بے عزّت کردیا تھا، تو آج مسلمانوں میں عبداللہ سے زیادہ بہادر کون ہوسکتا تھا؟ اور اگر گوری نے یہی برتاؤ عبداللہ کی بہنا یا لڑکی کے ساتھ کیا تھا تو گوری کی بہادری کی تعریف آج گھر گھر میں ہونی ضروری تھی۔ اگر مقدمہ چلے تو دونوں قومیں اپنے اپنے بہادروں کے لئے چندہ دینے کو تیار ہیں۔ گنڈوں کو اس سے زیادہ اور چاہئے ہی کیا؟

پولیس بھی خوش تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کا آندولن حال ہی میں بند ہوا تھا اور یہ زمانہ گاندھی اِروِن سمجھوتے کا تھا۔ جنتا نے سمجھا تھا کہ ہماری جیت ہوگئی۔ تبھی تو لاٹ صاحب نے ہمارے مہاتما کو برابر کی طاقت مان کر اُن سے سمجھوتہ کیا تھا۔ آج تک تو سرکار کہتی تھی کہ ہم کانگریس کو پورے ہندستان کی نمائندہ جماعت نہیں سمجھتے۔ لیکن گاندھی نے سرکار کی تمام اکڑ ڈھیلی کردی۔ جنتا اب پولیس سے نہیں ڈرتی تھی۔

لیکن اب وہی جنتا کیسی دوڑ دوڑ کر پولیس کے پاس پہنچتی تھی۔ کانپور کے لوگوں نے بلوے کی جانچ کمیٹی کے سامنے یہ بیان دیئے تھے کہ جب بازار میں بلوائی دوکانوں کے تالے توڑ رہے تھے تب پہرہ دینے پر تعینات ہتھیار بند پولیس کے سپاہی مزے میں بیٹھے بیٹھے تاش کھیلتے رہتے تھے۔ گھروں سے بچّوں کی،

عورتوں کی چیخیں آ رہی تھیں، اور انگریز سارجنٹ باہر کھڑا کھڑا کسی انگریزی گانے کی لے پر منہ سے سیٹی بجاتا رہتا تھا۔ کلکٹر کے پاس فون کیا جاتا تھا کہ بلوائیوں نے ہم کو گھیر لیا ہے! پولیس بھیجو، اور انگریز کلکٹر دہشت سے کانپتی ہوئی اس پکار کے جواب میں ہنستا ہوا کہتا تھا کہ "اِس وقت گاندھی کو یاد کرو، وہی تمھاری مدد کرے گا!"

اِس طرح بدیشی افسر اُس دن ہمارے دیش کا، ہماری آزادی کی لڑائی کا، ہمارے سب سے بڑے نیتا کا اپمان کر رہے تھے اور جنتا بے بس تھی۔

پر اس اندھیرے میں اُس وقت ایک بجلی سی کوندی اور اُس کی روشنی نے جیسے ایک راستہ سا دکھا دیا۔ جنتا نے، مظلوموں نے اور ظلم کرنے والوں نے بھی دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا سا آدمی، ننگے سر ننگے پیر، اُس جلتی آگ میں پاگلوں کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی بھی نہیں ہی، لیکن وہ ہتھیاروں کی بھیڑ میں بے دھڑک گھس جاتا ہی۔ وہ دیکھو، وہ ایک مکان کے سامنے کھڑا ہی۔ اوپر چھت سے عورتیں، بچے اور آدمی گھبرائی اور ڈری ہوئی نظروں سے اُس کی طرف اور اُس بھیڑ کی طرف جو اُن کے مکان میں آگ لگانے کو تلی ہوئی ہی، دیکھ رہے ہیں۔ مکان ہندو کا ہی۔ بھیڑ مسلمانوں کی ہی۔ مسلمان کہہ رہے ہیں کہ فلاں محلے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے اتنے مکان جلا ڈالے ہیں اور جب تک ہم اس سے دُگنے مکان ہندوؤں کے نہیں جلا ڈالیں گے، تب تک چین نہیں لیں گے۔ تھوڑی ہی دور پہ پولیس کے

پانچ جوان بندوقیں لیے ہوئے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ اُن کو گولی چلانے کا حکم ہی نہیں ہے، اسلئے وہ کیا کریں؟ ہندو محلّوں میں آج جو لوگ مسلمانوں کو مارنے جلانے کی تیّاریاں کر رہے ہیں، وہ ایسی خطرناک جگہوں پر جھانکنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ تو چاروں طرف سے پھنسے ہوئے بے بس مسلمانوں کی 'صفائی' کرنے میں لگے ہوئے ہیں، لیکن یہ دُبلا پتلا آدمی ایسی ہی جگہ پہنچتا ہے۔ مٹّی کے تیل کا کنستر اُس نے ایک بلوائی کے ہاتھوں سے چھین لیا ہے اور وہ بھیڑ سے کہہ رہا ہے: "میرے پیارے بھائیو! ذرا سوچو کہ تم کس مذہب کے ماننے والے ہو۔ کیا 'اسلام' یہی کہتا ہے؟ کیا قرآن کی یہی تعلیم ہے؟ کیا تمہارے پیغمبر حضرت محمد نے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دَیا اور مہربانی کا برتاؤ نہیں کیا، جو اُن کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے؟"

بھیڑ میں کچھ لوگوں پہ اس کا اثر ہوتا ہے، لیکن تبھی ایک جوشیلا نوجوان آگے بڑھ کر کہتا ہے "ذرا اپنے ہندوؤں کی حرکتوں پر بھی تو غور کرو۔ پہلے اُنکو سمجھاؤ، پھر یہاں آنا۔ اب ہٹ جاؤ، ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟ مجھے مار ہی تو ڈالوگے۔ تو لو، میرا سر جھکا ہوا ہے۔ لیکن اپنے جیتے جی میں تم کو اسلام کے نام پر داغ نہیں لگانے دوں گا۔ میں ہندوؤں سے کیا کہتا ہوں یہ جاکر اس محلے کے مسلمانوں سے پوچھو۔ وہ تم کو بتلائیں گے کہ وہاں سے اُن کو کس نے نکالا ہے مجھے ہندو مسلمانوں سے کیا مطلب؟ جو بے گناہوں کا خون کر رہے ہیں، کیا وہ بھی ہندو یا مسلمان ہیں؟"

بھیڑ خاموش ہے اوپر سے سہمے ہوئے بچّے اور عورتیں دیکھ رہی

ہیں۔ اُن کے دل دھڑک رہے ہیں۔ یہ کون ہے، جس نے ان کو موت کے منہ سے نکال لیا ہے؟

"تو اب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ آپ صاف صاف بتلائیے کہ آپ کا ارادہ کیا ہے؟" اُس نے پھر بھیڑ سے کہا۔

بھیڑ سے کچھ آدمی آگے بڑھتے ہیں اور ملائم آواز میں کہتے ہیں "آپ یقین رکھئے، یہاں اب کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ لیکن آپ ہندوؤں کو بھی سمجھائیے۔"

"میں ہندوؤں سے بھی اسی طرح کہتا ہوں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اُسکے لئے مجھے شرمندگی ہے۔ آپ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر مجھے بھروسہ دیجئے کہ یہاں کے ہندوؤں کی پوری طرح حفاظت ہوگی!"

"اس کا اطمینان ہم کیسے دلائیں؟ گنڈوں پہ ہمارا کیا بس ہے؟ ہاں آپ ہندوؤں کو یہاں سے نکال لے جائیں، تو ہم اپنی حفاظت میں انکو ہندو محلّوں میں پہنچا دیں گے۔"

اب اس محلّے سے ہندو نکالے جا رہے ہیں۔ وہ آدمی چار چار بچّوں کو گود میں لئے گھیرے ہوئے ہندوؤں کو حفاظت کی جگہ لے جا رہا ہے۔ جو بھیڑ آگ لگانے پر تلی ہوئی تھی، وہی ان ہندوؤں کو حفاظت کی جگہ پہنچا رہی ہے۔

بھیڑ میں ایک آدمی جو شاید کانپور میں باہر سے آیا تھا، ایک دوسرے آدمی سے پوچھتا ہے کہ "کیوں بھائی، یہ ہے کون؟ بڑے جیوٹ کا آدمی معلوم ہوتا ہے!"

"ارے ان کو نہیں جانتے؟ یہ ہیں گنیش شنکر ودیارتھی۔ "پرتاپ"

اخبار نکالتے ہیں اور یہاں کے کانگریسی لیڈر ہیں۔ کم سے کم اس آدمی میں تعصب نام کو بھی نہیں ہے۔ میں نے بھی سنا ہے کہ اس نے بہت سے مسلمانوں کو بچایا ہے۔"

"اچھا؟" پوچھنے والے نے تعجب سے کہا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ سب ہندو بھی ایک سے نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ شریف بھی ہیں۔

اور یہ ہندو محلّہ ہے۔ صرف ایک مسلمان خاندان یہاں رہتا تھا۔ اس وقت اُسی کو ہندوؤں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ محلّے کے بڑے بوڑھوں نے منع کیا، لیکن اُن کی سُنتا ہی کون ہے؟ بھلا دھرم کے معاملے میں بھی بڑے بوڑھوں کی سُنی جاتی ہے؟

اوپر چھت سے عورتیں چیخ رہی ہیں، لیکن بھیڑ ہنس رہی ہے۔ کواڑوں پر کلہاڑے چل رہے ہیں اور بجرنگ بلی کی جے کے نعرے لگ رہے ہیں اُن بجرنگ بلی کی جے کے، جو مصیبت میں گھری ہوئی سیتا ماتا کیلئے اکیلے ہی راکشسوں کی نگری میں چلے گئے تھے اور اُن کے ہی ماننے والے خود عورتوں کی عزّت لوٹنے کو تیار ہیں۔

دروازہ ٹوٹ چکا ہے۔ عورتیں اور بچے چیخ رہے ہیں۔ بھیڑ گھر میں گھسنا ہی چاہتی ہے کہ ودّیارتھی جی یہاں بھی موجود ہیں۔ وہ دروازہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں "میرے جیتے جی تم ایسا نہیں کر سکتے!"

"ان کانگریس والوں نے ہی ہندو جاتی کا ناس کیا ہے"۔ ایک نوجوان بڑبڑاتا ہے۔

"ودّیارتھی جی! آپ یہاں تو مہربانی کیجئے۔ ہمیں آپ کے اُپدیشوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری ماں بہنوں کی لاج لوٹی

جا رہی ہو اور آپ یہ اُپدیش دیتے پھرتے ہیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی!"

"شرم تو مجھے تب آوے گی، جب آپ کو یہ سب کرنے دوں اور کھڑا کھڑا دیکھتا رہوں۔ ماں بہنوں کی لاج کا لوٹنا اگر آپ بُرا مانتے ہیں تو خود یہ کام کیوں کر رہے ہیں؟"

"مسلمانوں کو بھی یہ سمجھائیے نہ!"

"اُن کو بھی سمجھاتا ہوں۔ ابھی .... محلے سے چلا آ رہا ہوں۔ وہاں سے دو سو ہندوؤں کو نکال کر ہندو محلوں میں مَیں نے ابھی پہنچایا ہے۔ یقین نہ ہو تو میرے ساتھ چل کر دیکھ لو!"

"یہ بحث ہمیں نہیں چاہیے۔ اب آپ یہاں سے ہٹ جائیے بڑے آئے کانگریسی!" ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر ودیارتھی جی کو دھکا دے دیا۔ اس پر کچھ لوگوں نے اُس نوجوان کو پیچھے کھینچ لیا اُن میں کتنا ہی جوش ہو، پر ودیارتھی جی کی بے عزتی نہیں برداشت کر سکتے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ودیارتھی جی اُس مسلمان خاندان کو ایک مسلمان محلے کی طرف لئے جا رہے تھے۔ اُن دنوں چوبیسوں گھنٹے وہ اسی کام میں لگے رہتے تھے۔ اس میں ہر ایک قدم پر موت کا سامنا ہوتا تھا، لیکن دیش کی عزت اور بے گناہوں کی جانیں انکو اپنی جان سے زیادہ پیاری تھیں۔

سرکاری افسروں نے، پھوٹ پرستوں نے اور گنڈوں نے ودیارتھی جی کا یہ کام دیکھا تو اُنکی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگا۔ اسکا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ کانگریسی لوگ پولیس اور فوج سے بھی زیادہ طاقت

رکھتے ہیں۔ پردے کے پیچھے پھر کچھ کھس پھس ہوئی اور اس کانٹے کو بھی ہٹانے کا انتظام کر لیا گیا۔ جسے دیکھ کر ہتیاروں کے ہاتھ سے تلوار گر پڑتی تھی، اُسی کی ہتیا کرنے کی سازش اب اُن لوگوں نے کی، جو اپنے کو پڑھا لکھا اور مہذب کہتے تھے۔ لیکن اس خونی گھٹنا کو بتانے سے پہلے ودیارتھی جی کی زندگی پر بھی ایک نظر ڈال لیں، جس سے ہم سمجھ سکیں کہ ہمارے دیش کا کتنا قیمتی ہیرا اُس سمے ہماری ہی حیوانیت سے مٹی میں رل گیا۔ ہم نے اپنے کتنے بڑے لیکھک یا کتنے سچے اور بہادر دیش بھکت کا اپنے ہی ہاتھوں خون کر دیا تھا۔ ہائے ری ہماری جہالت۔

× × × × ×

الٰہ آباد کے اترسوئیا محلے میں وکرمی سمبت کے مطابق کنوار سُدی ۱۴، دن اتوار سن ۱۹۴۷ یا عیسوی سن ۱۸۹۰ میں، ایک معمولی کھانے پینے کا یستھ خاندان میں شری گنیش شنکر جی ودیارتھی کا جنم ہوا تھا۔ آپ کے پتا جی کا نام منشی جے نارائن اور آپ کی ماتا جی کا نام شری گومتی دیوی جی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ودیارتھی جی ماں کے پیٹ میں تھے، تب ودیارتھی جی کی نانی نے سپنے میں گنیش جی کی مورتی دیکھی تھی اور اس لیے اُنھوں نے ہی ودیارتھی جی کے پیدا ہونے پر اُن کا نام گنیش شنکر رکھا تھا۔

ودیارتھی جی کے شروع کے ڈھائی برس اپنے نانا منشی سورج پرساد جی کے گھر میں بیتے، جو سہارن پور جیل کے نائب جیلر تھے۔ مشہور ہے کہ ودیارتھی جی کے نانا جب جیل سے باہر لوٹتے تھے، تب

جیل میں بنی ہوئی ایک ڈبل روٹی اپنے پیارے نانی کے لئے روزانہ لے آتے تھے اور ودّیارتھی جی بڑے شوق سے اُسے کھاتے تھے۔ شاید جیل کی روٹی کی یہ چاٹ ہی انکو بار بار جیل میں کھینچ لے گئی۔

ودّیارتھی جی کی شروع کی تعلیم گوالیر میں ہوئی کیونکہ اُن کے پتا گوالیر ریاست کے بھوگاولی قصبے میں وہاں کے ایک اسکول کے سکنڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کے پتا جی کا تبادلہ بھیلسا ہو گیا، وہاں آپ انگریزی پڑھتے رہے۔ سنہ۱۹۰۵ء میں آپ نے انٹرنس پاس کیا۔

انٹرنس پاس کرنے کے بعد بھی آپ نے پڑھنا چاہا۔ الہ آباد کے کایستھ پاٹھ شالا میں آپ نے نام بھی لکھوالیا۔ لیکن روپیہ پیسے کی تنگی نے آپ کو پڑھنے نہیں دیا۔ مجبور ہو کر آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اُس زمانے میں، بھارت میں انگریزی راج، کتاب کے لیکھک اور مشہور دیش بھگت پنڈت سندر لال جی الہ آباد سے "کرمیوگی" اخبار نکالا کرتے تھے۔ اُس اخبار کے سمپادن میں ودّیارتھی جی بھی کافی مدد کرتے تھے۔ شاید دیش کی آزادی کا خیال بھی اسی زمانے میں آپ کے دل میں پیدا ہوا۔

اس کے بعد کسی نوکری کی تلاش میں آپ کانپور آ گئے، جہاں آپ کے بڑے بھائی شیوورت جی رہتے تھے۔ ۹ر فروری سنہ۱۹۰۸ء کو آپ کانپور کے کرنسی آفس میں، تیس روپیہ مہینے پر کلرک ہوئے۔ اس زمانے میں بھی آپ اکثر کتابیں اور اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ اس

پر ایک انگریز افسر سے آپ کی جھپٹ ہوگئی اور آپ نے استعفٰی دیدیا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں آپ کانپور کے پرتھوی ناتھ ہائی اسکول میں بیس روپے مہینے پر ماسٹر ہوگئے۔ اُس زمانے میں سندر لال جی کے 'کرمیوگی' اخبار کی بڑی دھوم تھی۔ آپ کا تو شروع سے ہی اس اخبار سے لگاؤ تھا، اسلئے جب آپ اسکول پہنچتے تب اکثر آپ کی جیب میں 'کرمیوگی' بھی ہوتا تھا۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر نے آپ کی جیب میں 'کرمیوگی' دیکھا تو آپ کو ایسے 'بغاوت' پھیلانے والے اخبار کو پڑھنے سے منع کیا۔ اس پر آپ نے یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔

اسی زمانے میں آپ نے دو ایک لیکھ لکھے، جو ہندی کی مشہور پتریکا 'سرسوتی' میں چھپے۔ اسکے ساتھ ہی آپ 'کرمیوگی' میں اور 'سوراجیہ' میں بھی لکھتے تھے۔ 'سوراجیہ' اخبار اسکے لئے مشہور ہے کہ بغاوت پھیلانے کے جُرم میں کچھ ہی مہینوں کے بھیتر ایک کے بعد ایک اُسکے سات سمپادکوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ اسکے بعد تو وہ اخبار بند ہی ہوگیا۔ یہیں سے آپ کو اخبار نویسی سے دلچسپی ہوگئی اور کچھ دنوں 'سرسوتی' اور 'ابھیودے' میں نوکری کرنے کے بعد آپ نے 'پرتاپ' اخبار نکالنا شروع کردیا۔

'پرتاپ' کا پہلا انک ۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو نکلا۔ شروع میں وہ ہفتہ میں ایک بار نکلتا تھا، بعد میں ۱۹۱۹ء سے وہ روزانہ نکلنے لگا۔ لیکن اس اخبار کے ذریعے مالدار بننے کی خواہش کبھی ودیارتھی جی کے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ شروع سے ہی 'پرتاپ' اخبار غریبا

اور بےبس جنتا کی آواز بن گیا تھا۔ پولیس کے ظلموں کی کہانیاں وہ دھڑاکے سے چھاپتا اور ریاستی جنتا پر ہونے والے راجاؤں کے اتیاچاروں کا ایسی نڈرتا سے پردہ فاش کرتا تھا کہ بڑے بڑے راجہ بھی 'پرتاپ' سے دہشت کھاتے تھے۔ اسکے نتیجے میں ہمیشہ ودیارتھی جی پر کوئی نہ کوئی مقدمہ چلتا رہتا تھا اور ہمارے صوبے کی سرکار 'پرتاپ' سے لمبی لمبی ضمانتیں مانگ کر ضبط کرتی رہتی تھی ودیارتھی جی کو لاکھوں روپے کا لالچ بھی دیا گیا کہ وہ کسی خاص معاملے میں چپّی سادھ لیں۔ لیکن ودیارتھی جی نے کبھی اپنے سکھ آرام کو ترجیح نہ دی، اسلئے ایسے لالچ اُن پر کیا اثر کرتے؟ اپنے اصولوں کے وہ اتنے سچے تھے کہ کئی بار، اُن لوگوں کی خاطر جو اُنکے اخبار کو خبریں بھیجتے تھے، وہ خود سزا کاٹ آئے۔ سرکار نے زور ڈالا کہ وہ خبر بھیجنے والوں کا نام بتا دیں، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔

جن لوگوں نے ودیارتھی جی کے ساتھ کام کیا ہے، وہ بتاتے ہیں، کہ اُن کی زندگی بھوکوں مرتے ہی کٹی۔ جب کبھی چار پیسے ہوتے، کوئی نہ کوئی ضرورت مند آ کر ان کو لے جاتا۔ فرار کرانتی کاری اُن کے یہاں مہینوں رہتے اور ودیارتھی جی کسی نہ کسی طرح اُن کی ضرورتیں پوری کرتے ہی تھے۔ سردار بھگت سنگھ جی بھی 'پرتاپ' آفس میں کئی مہینے تک رہے تھے۔

کوئی کانگریسی ساتھی جو جیل چلا جاتا تو ودیارتھی جی اُس کے خاندان کی فکر رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایسے لوگوں کی میں اُنھوں

نے مدد کی، جو زندگی بھر ان کے خلاف رہے۔ اگر آس پاس کے کسی گاؤں میں پولیس کی زیادتی سنتے تو ودیارتھی جی وہاں ضرور پہنچتے۔ اس طرح جنتا کے ادھیکاروں کے لئے لڑنے والے وہ ایک اتھک یودھا تھے۔ بے سہارے دیش بھکتوں کے سہارے تھے اور کانپور ضلع کی کانگریس تو اُن کے سہارے چلتی ہی تھی۔

ودیارتھی جی کے دل میں دیش بھکتوں کے لئے کتنا درد تھا، اسکی ایک مثال یہ ہے کہ کاکوری کیس میں جب ٹھاکر روشن سنگھ جی پھانسی پر چڑھ گئے تو وہ اپنے پیچھے اپنی ودھوا اور ایک جوان لڑکی بھی چھوڑ گئے۔ بیچاری ودھوا نے بڑی مشکل سے لڑکی کی شادی طے کی، لیکن گاؤں کے تھانے دار نے اپنی سرکار پرستی کے زعم میں لڑکے والوں کو ڈرا دیا اور وہ رشتہ کرنے سے انکار کرنے لگے۔

اب ودھوا کو بڑی بھاری پریشانی تھی، لیکن وہ کیا کرے؟ آس پاس کے کانگریس والوں کو بھی خبر بھیجی گئی، لیکن وہ ۱۹۲۹ء کا زمانہ تھا، اسلئے سب چپّی سادھ گئے۔ لیکن کسی طرح اس کی خبر ودیارتھی جی کو لگ گئی اور دوسرے ہی دن ودیارتھی جی اُس گاؤں میں موجود تھے۔ ودیارتھی جی سب سے پہلے اُس تھانے دار کے پاس گئے اور اُسے کافی ڈانٹ بتائی۔ اسکے بعد لڑکے والوں سے ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے رشتہ کرنا منظور کر لیا۔ اسکے بعد شادی کے دن ودیارتھی جی پھر وہاں پہنچے اور اُنھوں نے لڑکی کے باپ کا کام خود ہی کیا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ اُس تھانے دار سے ودیارتھی جی نے کنیا دان کی رسم ادا کرائی۔ اس طرح ودیارتھی جی نے اُس

بے چاری ودھوا کی ایک بھاری مشکل آسان کر دی۔ آج ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنے شہیدوں کے خاندان کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔

ودیارتھی جی کی قابلیت کا تو کہنا ہی کیا؟ جب بولنے کھڑے ہوتے تو اُن کا ایک ایک لفظ سننے والوں کے دلوں میں اُترتا چلا جاتا تھا۔ ایسا ہی پُر اثر لکھتے بھی تھے۔ صرف انٹرنس پاس تھے، پھر بھی انگریزی کی کئی کتابوں کا ایسا کامیاب ترجمہ کیا کہ بڑے بڑے لیکھک دانتوں تلے انگلی داب گئے۔ اُن کے محنتی ہونے کا یہ حال تھا کہ ابھی اخبار کے لئے ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں اور ابھی اُس پر ٹکٹ بھی لگا رہے ہیں۔ کبھی کبھی اخباروں کو خود ہی لاد کر ڈاکخانے تک بھی پہونچا آتے تھے۔ کانگریس کے کام میں گاؤں کو پیدل چل دیتے تھے۔ نہ ہوتا تو سائیکل نہ جاننے کی وجہ سے کسی سائیکل چلانے کے جانکار کو ساتھ چلنے کے لئے راضی کر لیتے اور پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ کر بیس بیس میل چلے جاتے تھے۔ اُن کا شریر دُبلا پتلا تھا، لیکن آتما اُنھوں نے لوہے کی پائی تھی۔

اپنی اُس چھوٹی سی زندگی میں ہی اُنکو اونچی سے اونچی عزت ملی۔ کونسل کے ممبر رہے، کل ہند ہندی ساہتیہ سمیلن کے سبھاپتی رہے، صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے پریسیڈنٹ رہے اور جب کانپور میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تب سواگت کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی ودیارتھی جی ہی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تمام عہدے

اُن پر جبراً تھوپے گئے تھے، ورنہ اُن سے وہ زندگی بھر دور بھاگتے رہے۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ اگر کہیں آج وہ ہوتے تو کانگریس والوں میں جو لالچ اور آپا دھاپی مچی ہوئی ہے، اُسے دیکھ کر اُن کے دل کو کیسی پریشانی ہوئی ہوتی؟ اس معاملے میں وہ پنڈت جواہر لال جی سے ملتے جلتے تھے۔ جن کو طاقت ہاتھ میں رکھنے کے لئے کبھی کوئی پارٹی بنانے کا خیال ہی نہیں آتا۔ اُنکے پاس ان باتوں کے لئے وقت ہی کہاں تھا؟

اور اسی لئے تو جب اُنھوں نے دیکھا کہ آج اُن کے شہر کانپور میں سرکاری افسر کانگریس کی عزت دھول میں ملائے دے رہے ہیں اور جنتا اُن کے بہلاوے میں آگئی ہے تو وہ اور کانگریسیوں کی طرح اسے نہیں دیکھتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ اور سنہ ۴۷ کے ہندو مسلم بلووں کے وقت کس طرح ہمارے بہت سے کانگریسی بھائی اپنی لیڈری بنائے رکھنے کے لئے جنتا کی ہاں میں ہاں ملانے لگے تھے اور اپنی اپنی قوم کی فرقہ پرست جماعتوں میں مل گئے تھے۔ اسی طرح ودیارتھی جی بھی چاہتے تو اس وقت ہندو جنتا کی آنکھوں کے تارے بن جاتے۔ اس کے لئے اُن کو اپنے کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس اپنے اخبار میں مسلمانوں کے خلاف لکھ دیتے یا ہندوؤں کی ایک دو گپت سبھائیں کر لیتے اور اُن میں تقریریں جھاڑ دیتے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ بلووں کے وقت سیکڑوں آدمی اپنی قوم کے لیڈر بن جاتے ہیں اور ہزاروں روپیہ الگ پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن ودیارتھی جی نے وہ راستہ چنا جس

سے ہندو بھی ناراض ہوتے تھے اور مسلمان بھی۔ جب ودّیارتھی جی ہندوؤں کی حفاظت کرتے تو مسلمان کہتے "کانگریسی نیتا ہے، لیکن اپنی قوم کا پکش پات کرتا ہے۔ اتنے مسلمان مارے جاتے ہیں، وہاں نہیں پہنچتا" اور جب ودّیارتھی جی مسلمانوں کو بچاتے ہوئے دکھائی دیتے تو ہندو کہتے "ان کانگریسیوں کو سوائے مسلمانوں کی خوشامد کے اور کچھ آتا ہی نہیں۔ ہندو چاہے جتنے بھی مر جائیں ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن ایک بھی مسلمان کے چوٹ لگ گئی تو اُن کا دم نکل جاتا ہے۔ دھرم دروہی کہیں کے!"

ودّیارتھی جی دونوں کی ہی گالیاں سُن لیتے تھے۔ جانتے تھے اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور؟ یہ تو دوسروں کے بہکائے ہوئے اپنے مطلبی نیتاؤں کے ہاتھوں کھیل رہے ہیں۔ ان گالی دینے والوں میں سے نہ تو ہندو اُن محلّوں میں پہنچتے ہیں، جہاں ہندوؤں کو خطرہ ہے اور نہ مسلمان اُن محلّوں میں پہنچتے ہیں، جہاں مسلمانوں کو خطرہ ہے۔ اسلئے یہ نہیں سمجھ پاتے کہ میں تو دونوں کو ہی بچاتا ہوں شاید کسی دن یہ سمجھ سکیں۔

اور "کسی دن" تو جنتا نے، اُن گالی دینے والوں نے، اصل بات سمجھی ہے۔ لیکن کب.....؟

* * *

شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ جب ودیارتھی جی کے کام سے بلوے کی آگ دھیمی پڑنے لگی تو اُن سب لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹنے لگے۔ جن کا ہاتھ اس بلوے میں تھا۔ ویسے بھی ودّیارتھی جی

ہمیشہ اُن کی آنکھوں میں کھٹکتے رہتے تھے، پولیس ناراض تھی کیونکہ اُس کی رشوت کی کہانیاں 'پرتاپ' میں چھپتی تھیں۔ سرکاری افسر ناراض تھے، کیونکہ اُنھوں نے ذرا بھی بے ضابطگی کی اور 'پرتاپ' نے اُن کے کان پکڑ لیے۔ زمیندار اور مل مالک پریشان تھے کیونکہ ودّیارتھی جی نے غریب کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کر کرکے اُنکو 'شیر' کر دیا تھا۔ اب زمیندار کسان کو پٹواتا تھا، تو کسان مقابلہ کرتا تھا اور مزدوروں کی تنخواہ گھٹائی جاتی تھی تو ہڑتال ہوجاتی تھی۔ کونسلوں کی ممبری اور چنگی کی چیرمینی سے بھی رئیسوں کا رشتہ ختم ہوتا جاتا تھا اور ودّیارتھی جی کی بھڑکائی ہوئی جنتا اُن لوگوں کو چاہنے لگی تھی جو رئیسوں سے دبتے نہیں تھے۔ پھر کیوں نہ اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیئے دور کر دیا جائے؟

شری پٹابھی سیتارمیہ نے اپنی کتاب "کانگریس کے اتہاس" میں یہ صاف صاف لکھا ہے کہ "ودّیارتھی جی کو دھوکا دیکر ایک جگہ سے جایا گیا، جہاں وہ سچّے ستیہ گرہی کی طرح بنا کسی ہچک کے چلے گئے اور پھر وہیں وہ قتل کر دئے گئے" اور ودّیارتھی جی کے نزدیکی دوست پنڈت سری رام شرما سمپادک 'وشال بھارت' نے اس لیکھ کے لیکھک کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"ودّیارتھی جی کی ہتیا میں سرکاری ادھیکاریوں کا پورا ہاتھ تھا......"

کہا جاتا ہے کہ اُن کا قتل مسلمانوں کے ہاتھوں سے اس لئے کرایا گیا، جس سے کہ بلوے کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھے۔ انکو خبر

دی گئی کہ فلاں محلّے میں ہندوؤں کو مسلمانوں نے گھیر رکھا ہے۔ اپنے کچھ مسلمان ساتھیوں کو لے کر ودیارتھی جی فوراً اُس محلّے میں پہنچے ایک ہندو کو دیکھتے ہی مسلمانوں کی بھیڑ اُن پر جھپٹی، لیکن ودّیارتھی جی کے مسلمان ساتھی بیچ میں آ گئے اور اُنھوں نے بھیڑ کو بتایا کہ یہ تو گنیش شنکر ودّیارتھی ہیں، جنھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو بچایا ہے۔ اس پر بھیڑ فوراً رُک گئی۔ لیکن جو لوگ اسی کام کے لئے تعینات کئے گئے تھے، اُنھوں نے کچھ آگے جا کر ودّیارتھی جی پر پھر حملہ کر دیا۔ وہ ودّیارتھی جی کو کھینچ کر ایک گلی میں لے جانے لگے لیکن ودّیارتھی جی نے شانتی کے ساتھ اُن قاتلوں سے کہا: "کیوں گھسیٹتے ہو مجھے، میں بھاگ کر جان نہیں بچاؤں گا۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ اگر میرے مرنے سے آپ لوگوں کی خون کی پیاس بجھتی ہو، تو لو یہ سر حاضر ہے۔"

اس پر ودّیارتھی جی وہیں قتل کر دیے گئے۔ ہمارا تمام صوبہ جس کی روشنی سے جگمگا رہا تھا، اپنے اُس دیپک کو ہم نے اپنے ہی ہاتھوں بجھا دیا۔

باپو جب بھی کہیں بلوہ ہونے کی خبر پاتے تھے، تبھی اُن کو ودّیارتھی جی کی یاد آتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تو گنیش شنکر جیسی موت چاہتا ہوں۔ اور بھگوان نے گاندھی جی کو ایسی ہی موت دی۔

یہ تھی ودّیارتھی جی کی شان کہ سب گرو کے چرنوں پر اُنھوں نے سب کچھ نیوچھاور کر

رکھا تھا، وہ گرد بھی اُن کی جیسی ہی موت چاہتا تھا۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ گنیش شنکر ہم کو سچّے بلیدان کا پاٹھ سکھا گیا ہے۔

کاش! ہم بھی اپنے اس دیش بھکت کی زندگی اور موت سے کچھ سیکھ پاتے!

سمپادک

آج کے شهید



شري لال موهن سين

شری لال موہن سین

کلکتے کی آگ جب دھیمی پڑ گئی اور پھوٹ پرستوں نے محسوس کیا کہ اُن کی ہزار کوششیں بھی اب عام جنتا کو ایک دوسرے کے گلے پر تلوار چلانے کے لئے نہیں اُکسا سکتیں تو اُنھوں نے بنگال کے کسی دوسرے حصّہ کو اس کام کے لئے تلاش کرنا شروع کیا اور اس کے بعد نواکھالی میں اور پھر نواکھالی کا اثر لے کر ہی بہار میں انسانوں کے خون کی جو ہولی کھیلی گئی، اُس سے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ پھوٹ پرست اپنی کوششوں میں آخر کامیاب ہو کر ہی رہے اور اسلام و ہندو دھرم کے اونچے و سنہرے ناموں پر وہ جلتی سیاہی پوتنا چاہتے تھے، اُس سے کہیں زیادہ سیاہی ان دونوں دھرموں کے شاندار ناموں پر لگ گئی۔ ہاں اس سلسلے میں اتنا کہہ دینا اور ضروری ہے کہ نواکھالی کے فتنے کو دوگنا، چوگنا، دس گنا اور کبھی کبھی تو اُس سے بھی زیادہ بڑھا کر دکھانے میں ہندو اور ہندی اخباروں نے اس آگ کو بڑھانے میں جانے یا ان جانے خوب ہی مدد دی اور جب اس کے نتیجے میں بہار میں خوں ریزی شروع ہوئی، تو

اُردو اخباروں نے بھی یہی شرمناک رویہ اختیار کر کے ملک بھر میں یہ آگ پھیلا دی، جس کا نتیجہ سرحد، پچھمی پنجاب، اور سندھ کے بے قصور ہندوؤں کو اور پوربی پنجاب و یو۔پی کے کچھ علاقوں کی بے قصور مسلمان جنتا کو بھوگنا پڑا۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اب بھی ان خون کے پیاسوں کی پیاس بجھ گئی ہے؟

نواکھالی میں جو دردناک گھٹنائیں گھٹیں، اُن سب کے بیچ وہاں کے ایک دیش بھگت نوجوان لال موہن سین کی شہادت کو بنگال کا دل کبھی بھول نہیں سکے گا۔

شری لال موہن سین نواکھالی کے پاس ہی بسے ہوئے سے دوبیا علاقے کے رہنے والے تھے اور اُن کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دیش بھگتی کی چاٹ لگ گئی تھی۔ اُن کے پتا مہاجنی کا پیشہ کرتے تھے اور گاؤں بھر میں اُن کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا شروع شروع میں تو لال موہن سین کے پتا کا ارادہ تھا کہ اپنے اس لڑکے کو وہ پڑھانے لکھانے کے بجائے دوکان داری کا کام ہی سکھا دیں، جس سے کچھ برس بعد ہی وہ اُن کو مدد دینے لگے، لیکن لال موہن سین کا ذہن دیکھ کر اُن کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا اور لال موہن سین گاؤں کی ہی پاٹھ شالا میں پڑھنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں لال موہن سین بیحد شرارتی تھے اور اُن کی وجہ سے اُن کے ساتھیوں اور اسکول ماسٹروں کا ناکوں دم رہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی لال موہن سین پڑھنے لکھنے میں اتنے تیز تھے کہ اُن کی شرارتیں بھی سب کو پیاری لگتی تھیں اور سبھی یہ کہتے تھے کہ یہ لڑکا آگے چل کر بہت نام پیدا کرے گا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لال

موہن سین نے انکی اس امید کو پورا کرکے دکھا دیا لیکن ذرا دوسرے روپ میں۔

گاؤں کی پڑھائی پوری ہوجانے کے بعد لال موہن سین کو آگے پڑھانے کا سوال پیدا ہوا، اور وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس، جو ان دنوں چیٹ گاؤں میں رہکر اپنی پڑھائی پوری کررہے تھے، بھیج دئے گئے؛ جن لوگوں نے ہندستان کی آزادی کی لڑائی کا اتہاس پڑھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے اس اتہاس میں چٹگاؤں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ جن دنوں لال موہن سین چٹگاؤں پہنچے، ان دنوں تو وہاں کرانتی کاریوں کا، جو ہنسا کے ذریعہ آزادی لینے پر یقین کرتے تھے ایک بہت بڑا سنگٹھن کام کررہا تھا اس سنگٹھن کے نیتا شری سوریہ سین تھے، جن کو ان کے ساتھی "ماسٹر دا" کے نام سے پکارتے تھے۔ انگریز سرکار کی تو سوریہ سین اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی اور برسوں تک وہ چھوٹا سا شہر ایک فوجی اڈا بنا کر رکھا گیا۔ سوریہ سین کے سر کے لیۓ سرکار نے کئی ہزار کا انعام بول رکھا تھا۔ لیکن تب تک، یعنی ۱۹۳۰ء میں بنگال کے دیہاتوں میں یہ فرقہ پرستی کا بھوت نہیں گھس پایا تھا، اسلئے وہاں کے ہندو اور مسلمان، چاہے غریب تھے، لیکن بہادر تھے اور سرکار کو ایک آدمی بھی اس علاقے میں ایسا نہیں مل سکا تھا، جو سوریہ سین کو پکڑوا دیتا، حالانکہ سوریہ سین اب چٹگاؤں خاص اور اسکے آس پاس کے دیہاتوں میں اپنے سنگٹھن کا کام دن رات کرتے رہتے تھے۔

لال موہن سین جب چٹگاؤں کے اسکول میں پڑھنے لگے، تو

اُنھوں نے سُنا کہ جن دیش بھکتوں کی بات وہ اپنے بڑوں سے ابھی تک سنتے آئے ہیں، اُن کا ایک سنگٹھن یہیں چٹگاؤں میں بھی ہے۔ لال موہن نے اُسی دن سے اُس سنگٹھن کا پتہ لگانا شروع کردیا اور نہ جانے کہاں سے ٹوہ لگاکر وہ ایک دن سوریہ سین کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور بڑی نڈرتا سے بولے کہ "ماسٹر دا! آپ مجھے بھی اپنے دَل میں شریک کرلیجیے"۔ سوریہ سین نے ایک بار لال موہن کو سر سے پیر تک آنکھ بھر کے دیکھا اور آدمی کو چھن بھر میں پرکھنے والے اُس جوہری نے فوراً ہی جواب دیا۔ "اچھی بات ہے۔ آج سے تم ہمارے دَل کے ممبر ہو"!

اُس سمے لال موہن کی عمر ۱۴ سال، جی ہاں، صرف چودہ سال کی تھی۔

سوریہ سین کے دَل کے بہت سے نوجوانوں کو اس بات پر تعجب تھا۔ ماسٹر دا خوب جانتے پہچانتے ہوئے بہت سے نوجوانوں پر بھی یقین نہیں کرتے اور اُن کو دَل سے دور دور ہی رکھتے ہیں اُنھوں نے اس انجان ۱۴ سال کے لڑکے پر اتنا گہرا یقین کیسے کرلیا؟ پر ماسٹر دا جانتے تھے کہ اُن نوجوانوں میں اور اس لڑکے میں کیا فرق ہے، کچھ دن بعد تو سب ساتھی بھی اس بات کو جان گئے تھے۔

اس کے کچھ ہی دن بعد ماسٹر دا اور اُن کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ غلامی کی نیند میں سوتے ہوئے اپنے ملک کو جگانے کے لئے کوئی ایسا کام کرنا چاہیئے جس کا اثر پورے دیش کی جنتا پر پڑ سکے، اور وہ سمجھ سکے کہ آزادی کی لڑائی ابھی بدستور جاری ہے اور اسے دیش بھگتوں کے خون کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے طے کیا گیا کہ

ایک بار ون دھارٹ نے چٹگاؤں کے سرکاری ہتھیار خانے پر چڑھائی کی جائے اور وہاں سے ہتھیار نکال کر تب تک لڑائی جاری رکھی جائے جب تک کہ دل کا ایک بھی آدمی زندہ رہے۔ یہ سب لوگ اتنا تو سمجھتے ہی تھے کہ اکیلے چٹگاؤں میں دو چار دن اس طرح لڑائی لڑ لینے سے کوئی سوراجیہ نہیں مل جائے گا اور اسکا سو فیصدی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم سب مارے جائیں گے۔ لیکن اُن کو تو صرف اپنے دیش واسیوں کو ایک راستہ دکھانا تھا اور اتنے بھر کے لئے اُنھوں نے اپنی جان قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ اسکیم جب بن گئی تو سب سے پہلے روپے کا سوال پیدا ہوا۔ آخر ہتھیار خانے پر چڑھائی کرنے کے لئے بھی کچھ سامان اور ہتھیاروں کی ضرورت تھی ہی۔ انت میں اسکے لئے بھی یہی فیصلہ ہوا کہ یہ روپیہ بھی دل کے ممبر ہی جُٹائیں۔ لال موہن یہ فیصلہ سُنتے ہی اپنے گاؤں کو چل دیا اور ایک دن جب اُسکے بابا کہیں گئے ہوئے تھے، تو اُن کے صندوق سے اُسے جو کچھ ملا، اُس نے ماسٹر دا کے آگے لا کر رکھ دیا۔ ماسٹر دا نے یہ دیکھا تو پل بھر کے لئے اُن پتھر جیسا دل رکھنے والے کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں اُنھوں نے لال موہن کو جیسے چھیڑتے ہوئے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ چوری کر کے لائے ہو!"

"چوری ہے بھی اور نہیں بھی ہے!" لال موہن نے فوراً جواب دیا۔ "چوری ہے اسلئے کہ بابا کے پیچھے اُن کا صندوق توڑ کر روپیہ لایا ہوں اور تب بھی میرا یہ کام چوری اس لئے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میں ایک خط کے ذریعے بابا کو یہ سوچنا دے آیا ہوں کہ روپیہ میں لئے جا رہا ہوں اور یہ روپیہ ایک اچھے کام میں ہی لگے گا۔ اسکے علاوہ اور چارہ

یہی کیا تھا ماسٹر دا؟"

کچھ ہی دن بعد ماں کا ایک پتر لال موہن کو ملا، جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ اس طرح سے روپیہ لے جانا حالانکہ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں کہا جا سکتا، لیکن روپیہ اگر کسی اچھے کام میں لگا ہو تو میرے آشیرواد تمہارے ساتھ ہیں۔"

ماسٹر دا نے بھی یہ خط دیکھا اور وہ من میں سوچنے لگے کہ اگر ایسی ماں کا لال موہن جیسا پُتر ہو تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

کچھ ہی دن میں جب اس طرح روپیہ اکٹھا ہو گیا تو ۱۸ اپریل ۱۹۳۰ کو چٹگاؤں کے سرکاری ہتھیار خانہ پر چڑھائی ہوئی۔ لال موہن کو ماسٹر دا نے یہ کام سونپا تھا کہ وہ چٹگاؤں کے آس پاس کی ریلوے لائن کو اُکھاڑ دے، جس سے کہ باہر سے فوراً ہی کوئی فوجی مدد یہاں کے افسروں کو نہ مل سکے۔ اسکے بعد ماسٹر دا کا اصرار تھا کہ لال موہن کو اپنے گھر واپس چلا جانا چاہیئے۔

لال موہن نے اپنا کام بڑی خوبی کے ساتھ پورا کیا۔ ۱۸ اپریل کی رات کو ۱۰ بجے ایک طرف چٹگاؤں کے ہتھیار خانے پر چڑھائی ہو رہی تھی اور دوسری طرف لال موہن نے اپنے دو ایک ساتھیوں کے سہارے دھوم اور منگل کوٹ کی پہاڑیوں کے پاس کی ریل کی تمام پٹریاں اُکھاڑ کر پھینک دی تھیں۔ اپنا یہ کام پورا کرنے کے بعد وہ چاہتے تو گھر واپس جا سکتے تھے، لیکن اُن کو معلوم تھا کہ دل کے جو ممبر ہتھیار خانے پر چڑھائی کرنے گئے ہیں، وہ اپنا کام پورا کر کے جلال آباد کی پہاڑیوں پر اپنا مورچہ لگائیں گے، اسلئے لال موہن بھی جلال آباد کی پہاڑیوں میں جا پہنچے اور اپنے ساتھیوں سے مل گئے۔

جلال آباد کی پہاڑیوں میں لال موہن کے ساتھیوں نے اپنا مورچہ بنا لیا تھا اور وہ اُن معمولی ہتھیاروں کے ساتھ ہی انگریزی فوج کا مقابلہ کر رہے تھے، جو سامنے کی پہاڑی پر توپوں اور مشین گنوں کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔ مقابلہ کافی دیر تک رہا لیکن آخرکار اُس پوری فوج کے سامنے نوجوانوں کی یہ ٹولی کب تک جمتی؟ آخر اس لڑائی میں گیارہ کرانتی کاری اور سرکاری فوج کے چونسٹھ سپاہی کھیت رہے۔ باقی کرانتی کاری گرفتار کر لئے گئے جن میں سے ایک لال موہن بھی تھے۔

اسکے بعد مقدمہ شروع ہوا۔ چٹگاؤں کے اُس زمانہ کے کلکٹر مسٹر ولکنسن، جو ہتھیار خانے پر حملہ ہونے کی خبر پاکر جان بچانے کے لئے بندرگاہ میں جا چھپے تھے، اب ان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ سزا دلانے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اُترے۔ کچہری آتے جاتے وقت یہ نوجوان دیش بھکتی سے بھرے ہوئے جو نعرے لگاتے تھے، اُن کو سُن کر مسٹر ولکنسن کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ اُسی جھنجھلاہٹ میں ایک دن اُنھوں نے لال موہن کی پیٹھ پر ایک ہلکی سی دھپ جما کر کہا "پاگل لڑکے! شور کیوں مچا رہا ہے؟"

لال موہن نے پیچھے مڑکر جیسے ہی صاحب کی شکل دیکھی وہ کرودھ سے لال ہوگئے۔ ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو وہ صاحب کی کھوپڑی پر دے مارنا ہی چاہتے تھے کہ صاحب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس فوری سوجھ بوجھ نے اُس دن ٹھیک وقت پر صاحب کی جان بچادی۔

مقدمے میں لال موہن کو زندگی بھر کے لئے کالے پانی کی سزا سُنائی

گئی اور ۵ ار اگست ۱۹۳۲ء کی شام کو ایک جہاز دھیرے دھیرے انکی جنم بھومی سے ان کو دور لے چلا۔ لال موہن کی اس وقت کی حالت کے بارے میں انکے ایک ساتھی نے لکھا ہے۔

"ایک جھروکے میں لال موہن کی آنکھیں اپنی جنم بھومی کی اور لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اپنی جنم بھومی کا ویوگ لال موہن کو اسی طرح بے کل کر رہا تھا جیسے کسی بچے کے سامنے اس کی ماں کی موت!"

انڈمان پہنچ کر بھی نوجوان لال موہن کے دل کی آگ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اپنی اس زندگی کا انھوں نے ایک دن بھی ایسا نہیں بتایا، جس میں انھوں نے حکومت کے قانونوں کو اپنی راضی رضا سے مانا ہو۔ اسکے لئے برابر انکو سزائیں ملتی رہیں، اور ایک بار تو انھوں نے ۳۸ دن کی لمبی بھوک ہڑتال بھی کی۔ اس وقت لال موہن ایک ایسے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ہو گئے تھے، جس میں زندگی واپس آتی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ لیکن پردیشی حکومت بھی ایسے بڑے دیش بھگت کی قیمتی جان لینے کا حوصلہ نہیں کر سکی اور لال موہن کی شرطیں انڈمان کے افسروں نے ٹھیک وقت پر پوری کر کے انکی جان بچالی۔ کاش! لال موہن اسی وقت شہید ہو گئے ہوتے تو ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے وہ باتیں تو نہ دیکھنی پڑتیں، جنھوں نے اس مہان دیش بھگت کے دل کو چھلنی کر دیا تھا۔

آخر قید کے دن ختم ہوئے اور پورے ۱۹ سال کالے پانی میں بتا کر اگست ۱۹۴۲ء میں لال موہن جیل سے باہر نکلے۔ اب بھی ان کا دل آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے کے حوصلوں سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے

سوچ لیا تھا کہ اس بار وہ مزدوروں میں کام کریں گے، جس سے سامراج شاہی کے مقابلے میں اُنکا ایک مضبوط مورچہ کھڑا کیا جا سکے۔ لیکن سب سے پہلے اُنھوں نے اپنی اُس ماں سے مل آنا ضروری سمجھا، جس نے لمبے لمبے سولہ برس جیل کی دیواروں کو تاکتے ہوئے بتائے تھے۔ جب لال موہن یکایک اپنی ماں کے سامنے جا کھڑے ہوئے تو کچھ دیر نہ تو ماں بیٹے کو پہچان سکی اور نہ بیٹا ماں کو۔ لیکن فوراً ہی بیٹا ماں کے پیروں پر لوٹ رہا تھا اور ماں اُسے اُٹھا کر کلیجے سے لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ رام اور کوشلیا کا ملن تھا، جس کے بیان میں مہاتما بالمیک نے کمال کر دیا ہے، پھر بھی وہ اسکی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکے ہیں۔ ۱۹ برس بعد کالے پانی سے لوٹے ہوئے بیٹے کا ملن! کون ہے جو اُس وقت کی خوشی کی تصویر شبدوں میں اُتار سکے؟ پر بیچاری ماں کیا جانتی تھی کہ یہ ابھاگا دیش آج حیوانوں کا، آدم خوروں کا دیش بن گیا ہے، ورنہ وہ دیوک کی آگ میں جلنا منظور کر لیتی اور اپنے لال موہن کو واپس کالے پانی بھیج دیتی۔

کچھ دنوں تک لال موہن برسوں سے بچھڑی ہوئی اپنی بہنوں و دوسرے رشتہ داروں سے ملنے جلنے میں لگے رہے۔ اسکے بعد وہ کلکتہ واپس آنا ہی چاہتے تھے کہ نواکھالی میں آگ بھڑک اُٹھی۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا۔ یہ سب اسلام کے نام پر کیا جا رہا تھا۔ اُس اسلام کے نام پر، جس میں سب سے بڑا حق پڑوسی کا بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک نئے قسم کا اسلام تھا، جس میں پڑوسیوں کو قتل کیا جا رہا تھا، اُن کے گھروں میں آگ لگائی جا رہی تھی اور اُن کی عورتوں کو بھگایا جا رہا تھا۔ لال موہن کا دل یہ سب دیکھ کر رو اُٹھا اور وہ سوچنے لگے

کہ کیا جس دیش کے لیئے اُنھوں نے اپنی تمام جوانی جیل کے سیخچوں کے
اندر بتا دی اور جسکی پوجا کرتے کرتے اُنھوں نے بڑی سے بڑی مشکلوں
کو ہنستے ہنستے سہن کر لیا اُسکیا اُسکی اصلی تصویر یہی ہے؟

اُس وقت نواکھالی کے ہندوؤں نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ لال
موہن چاہتے تو آسانی سے بھاگ سکتے تھے، لیکن اُنھوں نے بھاگنے سے
انکار کر دیا اور ایک شانتی کمیٹی بنا کر کام کرنے لگے۔ اس کمیٹی کے وہ خود
ہی منتری بنے اور سولہ سال کی جیل کی بھیانک تکلیفوں سے تھکے ہوئے شریر
کو لے کر انسان کو انسان بنانے کے کام میں جٹ پڑے۔ وہ جانتے تھے
کہ آج جنتا اور عام مسلمان اس مار کاٹ کو ناپسند کرتے ہیں، لیکن کچھ
لیڈروں اور کچھ گنڈوں کے مقابلے میں تمام جنتا کی چل نہیں پاتی۔ لال
موہن اس امن پسند جنتا کو سنگٹھت کرکے بلوائیوں کے خلاف ایک مورچہ
کھڑا کر دینا چاہتے تھے۔ اس کام میں اُن کو کچھ کامیابی بھی ملی۔ اور اُن کے آس
پاس کا علاقہ کسی حد تک اُس ستیاناسی آگ سے بچا رہا۔ لیکن اسکے نتیجے میں
گنڈوں کی آنکھوں میں لال موہن کانٹے کیطرح کھٹکنے لگے۔ گنڈوں نے یہ پرچار کرنا شروع
کیا۔ ایک طرف تو لال موہن امن کی باتیں کرتا ہے۔ اور دوسری طرف چپکے چپکے ہندوؤں کو
ہتھیار بٹا رہا ہے۔ ایسے وقتوں میں جنتا کا دماغ ویسے ہی خراب رہتا ہے، اسلئے اس بات پر یقین
بھی کیا جانے لگا۔ اُدھر باہر کے لوگوں نے نواکھالی کے قصّوں کو
جس طرح بڑھا چڑھا کر بتانا شروع کیا، اُس کا بھی جنتا پر کالی بُرا
اثر پڑا اور جو لوگ امن کی باتیں کرتے تھے، اُنکے دل میں بھی زہر
بھرنے لگا۔ لال موہن ان حرکتوں سے حیران ہو چلے۔ اُنکو کبھی
کبھی اس بات پر جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ نواکھالی کے مسئلے پہ یہ شور
غل مچانے والے یہاں کی ہندو جنتا کی مصیبتیں بڑھاتے ہیں اور خود

کایروں کی طرح دور ہی دور سے تماشا دیکھ رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے کام میں جٹے ہی رہے۔

اُن دنوں پچاسوں بہنوں کو لال موہن کے نام کا سہارا تھا اور پچاسوں خاندان اُن کی ہمت پر زندہ تھے۔ ابھی مسلمانوں کی نگاہوں میں بھی اُنکی بھاری ہمت تھی اور کیا مجال کہ لال موہن کے رہتے کوئی گنڈہ بیجا حرکت کر سکے۔ کئی مسلمان کاریہ کرتا بھی لال موہن کے کام میں شریک تھے اور اُنکی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

پر یکایک ایک دن لوگوں نے سُنا کہ لال موہن بھی اس غنڈہ گردی کے شکار ہو گئے۔ وہ کسی گاؤں کو جا رہے تھے کہ گنڈوں نے اُن کو گھیر کر مار ڈالا۔ اس طرح بھارت ماتا کا یہ اکلوتا لال خود اپنے ہی دیش واسیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔

ابھی لال موہن کو رہا ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔

اب اُس ماں کا حال کون بیان کرے جس نے اپنے لال کے انتظار میں ۱۹ برس چھاتی پر پتھر رکھ کر کاٹ دئے تھے اور جو ابھی اُس سے اپنے سُکھ دُکھ کی بات بھی اچھی طرح نہیں کر پائی تھی۔ ہمارے ابھاگے دیش نے یہ بدلہ اُس کی شاندار قربانی کا دیا تھا۔ اُس دن اُس علاقے کے سبھی سچے مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔

لیکن جن کے دل میں انسانیت نام کو بھی نہیں رہ گئی تھی، وہ اُسی ڈھرے پر چلتے رہے اور آج بھی اُسی ڈھرے

پھیلا رہے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ملک کی آزادی کا ورودھ کرتے رہے۔ اس لئے اُن کے دل میں اس دیش بھکت کی قیمت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ پر جو لال موہن اور اُن جیسے دوسرے دیش بھکتوں کی قربانیوں کی قیمت سمجھتے ہیں، کیا وہ اس شہادت سے کچھ سبق لے سکیں گے؟

سمپادک

گلے لگ کر مرے

ابھی حال کی ایک خبر ہے کہ بمبئی میں ایک ہندو نے اپنے ایک مسلمان دوست کو آسرا دیا۔ اس سے ہندوؤں کا ایک دل بھڑک اٹھا اور اس نے کہا "اپنے مسلم دوست کو ہمیں سونپ دو۔" ہندو نے اپنے دوست کو سونپنے سے انکار کیا۔ اس پر دونوں دوست موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ مرتے وقت دونوں ایک دوسرے کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھے۔ ایک جانکار نے مجھے بالکل اسی طرح یہ خبر سنائی تھی۔ اس خونخواری کے بیچ اس طرح کی یہ پہلی مثال نہیں ہے۔ پچھلے دنوں کلکتے میں خون کی جو ندیاں بہیں اُن میں بھی کئی جگہ ہندوؤں نے مسلمان دوستوں کو اور مسلمانوں نے ہندو دوستوں کو اپنی جان پر کھیل کر آسرا دیا تھا۔

انسان میں دیوتا یا فرشتے کا جو انش ہے، اگر اسکی جھلک کسی بھی وقت اور کہیں بھی نہ دکھائی دے، تو انسانیت مر جائےگی۔

بمبئی کے بڑے منتری شری بالا صاحب کھیر نے بہت زوردار شبدوں میں دو ایسے نوجوانوں کی مثال کا بیان کیا ہے، جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ضرور مار ڈالے جائیں گے، ایک مسلم بھیڑ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے دوڑ پڑے تھے۔ موت کو انھوں نے سچے دوست کی طرح اپنایا۔ ایسی پاک قربانی کی قیمت بے اندازہ ہے۔ کوئی ہلکے طریقے سے اس کا مذاق نہ اڑائے۔ اگر ایسی ہر ایک قربانی کا نتیجہ کامیابی ہو، تو جان پر کھیل جانا معمولی ہنسی کھیل ہو جائیگا۔ یہ گھٹنائیں ہم کو یہی سبق دیتی ہیں کہ اگر ایسے نمونے کافی تعداد میں ہمارے سامنے آئیں تو مذہب کے نام پر یہ بیوقوفی بھری مارکاٹ بند ہو جائے۔ سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ اس میں کہیں دکھاوا یا نقلی بہادری نہ ہو۔ ہم جیسے ہیں ویسے ہی دکھنے کی کوشش کریں۔

موہن داس کرم چند گاندھی

۱۵-۱۰-۴۷ء

۱؎ ہمیں امید ہے کہ ہم اگلے ایڈیشن میں ان دونوں شہیدوں کی زندگی کے پورے حالات دے سکیں گے۔

علی پور کے ڈسٹرکٹ جج

(بھن شکنتلا پربھاکر)

علی پور کے ڈسٹرکٹ جج بڑے نیک، سمجھدار اور تجربہ کار آدمی تھے۔ اُنکا خاصا بڑا پریوار تھا۔ اُن کا بنگلہ ایک شانت حفاظت کی جگہ، چڑیا گھر کے پیچھے تھا۔

سولہ اگست چھٹی کا دن تھا۔ لیگ کی سرکار تھی اور لیگ کی ہی طرف سے ہڑتال تھی۔ جج صاحب کو اُٹھتے ہی اخبار پڑھنے کا شوق تھا۔ جب تک اخبار نہ پڑھ لیں، چائے تک نہ پیتے تھے۔ آج سترہ تاریخ تھی۔ اخبار کا انتظار تھا۔ بار بار دروازے کی طرف جاتے اور جھنجھلا کر لوٹ آتے تھے۔ بات کیا ہے؟ ابھی تک اخبار والا نہیں آیا۔ اتنی دیر تو اُسے کبھی نہ ہوتی تھی۔ اتنے میں ان کی بڑی لڑکی آئی۔ بولی "چائے تیار ہے"

جج صاحب "چائے تیار ہو گئی؟ ابھی اخبار تو آیا نہیں۔ اچھا ٹھہرو ابھی آتا ہوں"

لڑکی: "آج اخبار والا نہیں آئے گا۔ کل لیگ کی ہڑتال جو تھی!"

جج صاحب: "ارے ہاں! یاد آیا۔ آج پیپر نہیں آئے گا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میرا اتنا وقت بیکار خراب کیا!"

لڑکی ہنستی ہوئی اپنے پاپا کا ہاتھ پکڑ کر چائے کیلئے اندر لے گئی۔

جج صاحب بنگالی ہندو تھے۔ بنگلے کے آس پاس کی بستی بھی ہندو بستی تھی۔ صرف کچھ چھوٹے موٹے مزدور پیشہ اور مسلمان، پھل والے یا غریب دھوبی آس پاس رہتے تھے۔ سولہ تاریخ ان سے گزر چکی تھی۔ جج صاحب کو پتہ تک نہ تھا کہ شہر میں کچھ ہوا ہے۔ کیونکہ وہ ایک الگ استھان میں رہتے تھے۔

جج صاحب کے بنگلے کے پیچھے آنگنے نما سنا مال کے گھر سے لگا ہوا ایک مسلمان دھوبی کا گھر تھا۔ دھوبی کے پریوار میں آٹھ دس آدمی تھے۔ کئی بچے تھے۔ وہ اُن سفید پوشوں کے کپڑے دھو کر اپنے بڑے پریوار کا پیٹ بھرتا تھا۔

اچانک ہندوؤں کا ایک دل صاف ستھرے کپڑے پہنے بڑے شور شرابے کے ساتھ، ہاتھوں میں ڈنڈے، لاٹھی، تلوار لئے اُس غریب مسلمان دھوبی کے گھر میں گھس پڑا۔ گھر کے سبھی پرانی استری بچے، بوڑھے، بڑے کانپ گئے۔ بات کی بات میں اس زمین کے پردے سے اُن کا نشان مٹ گیا۔ نہ جانے کیسے ایک پانچ برس کا بالک کسی طرح بھیڑ کی آنکھوں میں دھول جھونکتا گھر کے باہر بھاگ نکلا۔

جج صاحب چائے پی رہے تھے۔ اسی وقت پاس سے شور سنائی دیا۔ وہ چائے چھوڑ باہر بھاگے۔ ماں بیٹی اور سبھی اُنہیں

روکتے رہے۔ پر جج صاحب رک نہ سکے۔ آ ہی تو گئے باہر۔

انھوں نے دیکھا کہ ایک ننھا سا پانچ برس کا بچہ "بچاؤ کوئی بچاؤ" چلّاتا انھیں کی طرف بھاگا آرہا ہے۔ اسکے پیچھے پچاس ساٹھ کا جھنڈ تھا۔ معصوم بچہ کانپتا، چلّاتا، چھوٹی سی جان لئے آنکھ بند کئے دوڑتا چلا آرہا ہے۔ بھیڑ پیچھا کر رہی ہے۔ آوازیں آرہی ہیں ۔ "مارو سالے کو۔ یہ مسلمان ہے۔ دیکھو نکل نہ بھاگے یہ شکار!"

گھبرایا ہوا بچہ جج صاحب کو آتے دیکھ اُن کی طرف لپکا۔ "بچاؤ، بچاؤ" یہ کہہ کر جج صاحب سے جاکر لپٹ گیا۔ جج صاحب نے بھی "آؤ بیٹا، تمھیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا" کہکر گودی میں اُٹھا لیا۔ پچکارا اور دلاسا دیا۔ اُسکی پھول سی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ اُن کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

ابھی جج صاحب آنکھیں پونچھ بھی نہ پائے تھے کہ بھیڑ پاس آگئی اور شور مچا مچا کر کہنے لگی ۔ "اسے چھوڑ دو، اسے چھوڑ دو، یہ مسلمان ہے، یہ ہمارا شکار ہے۔ اسکی جان لئے بنا ہم نہیں رہیں گے"

جج صاحب "نہیں بھئی، اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس ننھے بچے کو مار کر کیا لوگے؟"

بھیڑ سے آوازیں آئیں "یہ مسلمانوں کا بچہ ہے، معلوم ہے کچھ آپ کو؟ آپ تو گھر بیٹھے آرام کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے کتنے خون کئے ہیں شہر میں کتنی لوٹ مار کی ہے؟ اسے چھوڑ دو، ہم اسکی جان لیکر رہیں گے"!

بچہ یہ سب دیکھ سن سہم کر جج صاحب سے اور زور زور سے لپٹا جارہا تھا۔ مانو وہ اُن کے اندر گھس جانا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈر سے بند تھیں۔

جج صاحب ــ "اس نے کسی ہندو کو نہیں مارا ۔ یہ بے قصور ہے یہ کسی کو مار بھی نہیں سکتا، کسی کو مارے گا بھی نہیں۔"

بھیڑ ــ "یہ سب ہم نہیں سننا چاہتے ۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو، چھوڑ دو!"

بدلے کے جوش میں گرم بھیڑ اور گرم ہوتی چلی گئی ۔ ادھر انصاف اور جان بچانے کے جوش سے گرم جج صاحب بھی اور گرم ہوتے گئے ۔ شیر کی طرح گرج کر بولے ۔ "نہیں، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا ۔ اب یہ میرا بچہ ہے، میری گود میں ہے، میرا ہے اور میرا ہے۔"

بھیڑ ــ "ہم کہتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں، اسے چھوڑ دو ۔ نہیں تو تمھیں بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

جج صاحب ــ "ہاں، مجھے مارو ۔ اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے!"

بھیڑ چلائی ــ "مارو، مارو ۔ بڑا بنا ہے انصاف کرنے والا ۔"

اس آواز کے ختم ہوتے ہی جج صاحب کے سر پر لاٹھی کا جما ہاتھ بیٹھا اور بغل میں چھری کا وار ہوا ۔ معصوم بچہ پھڑکا، کانپا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔

بھیڑ نے اس کے ساتھ کیا کیا، قلم نہیں لکھ سکتی، شیطان بھی ہوتا تو آنکھیں بند کر لیتا ۔

"بچہ بچانا" کہتے ہوئے اسکے دھرم پتا کے پران پکھیرو اُڑ گئے ۔ پر سفید پوش بھیڑ کی خون کی پیاس پھر بھی نہ بجھی ۔ آگے بڑھی، جج صاحب کے گھر میں گھس گئی ۔ کونے کونے کو چھان ڈالا ۔ پر کہیں کوئی مسلمان نہ ملا ۔ پھر بھی نہ پیاس بجھی نہ نشہ اترا ۔ آنسو بہاتی ماں بیٹی سے پوچھا ــ "بتاؤ مسلمان کہاں چھپا رکھے ہیں؟ بتاؤ نہیں

تو مکان میں آگ لگاتے ہیں ۔"

ماں سے اب نہ رہا گیا ۔ رونا چھوڑ پھٹ پڑی ۔" آگ لگا دو، ہم سب کو مار ڈالو ۔ اب تک یہاں کوئی مسلمان نہیں تھا، اب سو مسلمان چھپے ہیں ۔ نہیں بتاتے ۔ کرو جو جی میں آئے ۔"

بھیڑ کا رنگ بدل گیا ۔ وہ ٹوٹ پڑی ۔

پریوار اب دھاڑ مار کر رو پڑا ۔ اب وہ اناتھ تھا ۔

جن کو یہ گھٹنا معلوم ہے، ان سب کے دل میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ ہندو دھرم کی اصلی رکشا کس نے کی ؟ اُس بھیڑ نے یا جج صاحب نے ؟

[نیچے لکھا خط احمد آباد کے بھائی ہیمنت کمار نے ۸ جولائی ۱۹۴۶ کو
باپو کو لکھا تھا۔ سمپادک]

کل کے دنگے میں شری وسنت راؤ ہیگشٹے اور جناب رجب علی کا
دنگا روکنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ساتھ ایک جگہ خون ہوگیا۔ پہلے
وہ دنگے کو دبانے کے لئے رچی روڈ (گاندھی روڈ) کی طرف روانہ ہوئے۔
راستے میں انھوں نے دیکھا کہ ہندوؤں کا ایک دل کسی مسلمان کا خون کرنے
کے لئے اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ انھوں نے حملہ آور ہندوؤں سے کہا:۔ پہلے ہمیں
مار ڈالو، پھر انھیں مارنا۔ اپنے ان دردھنا بھرے شبدوں اور ایسے
مضبوط رُخ کی وجہ سے وہ اس مسلمان کو بچا سکے۔ وہاں سے وہ صوبہ کانگریس
کمیٹی کے کھدر والے مکان پر پہنچے۔ وہاں انھیں معلوم ہوا کہ جمال پور میں ایک
ہندو محلے کے چاروں طرف مسلمانوں کی بستی ہے اور وہاں کے ہندوؤں کی جان و
مال خطرے میں ہے اسلئے وہ مسلمانوں کو سمجھانے چل پڑے۔ وہاں دونوں پر خنجروں
سے سخت حملے کئے گئے اور دونوں وہیں کام آئے۔ ہندو مسلمان دونوں کا خون ساتھ بہا۔
شری وسنت راؤ کوئی ۳۲ سال کے جوان تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں دھراسنا کے حملے کے وقت
سے وہ کانگریس کی لڑائیوں میں ہمیشہ شامل ہوتے رہے تھے۔ وہ ہندستانی سیوادل کے
ایک اگوا تھے۔ جناب رجب علی بھی بھاؤ نگر اور دھندوکا کے ایک خاص کام کرنے والے
تھے انھوں نے بھی کانگریس کی لڑائیوں میں خاصا حصہ لیا تھا۔ وہ بھی ہندستانی
سیوادل کے ممبر تھے۔ انکی عمر تقریباً ۲۵ سال کی تھی۔

"اس طرح ایک ہندو اور ایک مسلمان نے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر دنگے کا شدھ اہنسکرتیت
سے سامنا کیا اور اپنی جان قربان کرکے دونوں شہید ہوئے۔"

محمود اور رمضان

(بہن شکنتلا پربھاکر)

علی پور کے ڈسٹرکٹ جج صاحب کی ہی طرح ایک اور گھٹنا بھی مجھے معلوم ہے، جس میں دو مسلمان نوجوانوں نے اپنے ہندو پڑوسیوں کو بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دی یہ گھٹنا جن کے ساتھ ہوئی، وہ ہمارے نزدیکی جان پہچان کے آدمی ہیں، اس لئے اس گھٹنا کی سچائی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

جنکے ساتھ گھٹنا ہوئی، ان کا نام مانک لال بھائی ہے۔ پہلے کانپور میں رہتے تھے لیکن کلکتے کے سیٹھ لکشمی رام جی کی مل میں ایک اچھی نوکری مل جانے سے کلکتے چلے آئے! مکان نہ ملنے سے کچھ دن ہمارے یہاں مہمان کے طور پر رہے، بعد میں ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو انھیں مل کے پاس ہی سڑک سے لگے ہوئے ایک مکان میں رہنے کو جگہ مل گئی۔ انکے گھر میں کل چار پرانی تھے۔ وہ خود انکی دھرم پتنی، ایک سولہ برس کی لڑکی اور ایک اٹھارہ برس کا لڑکا۔ انکے پرانیوں کے لیئے وہ جگہ کافی تھی۔

نئے مکان میں گئے ہوئے چار دن ہی ہوئے تھے کہ ۱۶ اگست آپہنچا۔ لیگ کی طرف سے ہڑتال کا اعلان ہوا اور اس ہڑتال کا زور مانک لال بھائی کے مکان کے آس پاس کافی تھا، کیوں کہ اُس علاقے میں زیادہ تر دوکانیں مسلمانوں ہی کی تھیں۔ مانک لال جی کے مکان کے نچلے دونوں حصّوں میں بھی مسلمان ہی تھے۔

مکان سے لگی ہوئی ایک بنیائن کی دوکان تھی۔ جس پر محمود اور رمضان دو بھائی بیٹھا کرتے تھے۔ اُن کے راج نیتک خیالات تو لیگ کی طرف جھکے ہوئے تھے، لیکن اُن کی بھلمنساہٹ راستہ چلتے آدمی کو بھی موہ لینے والی تھی۔ ۱۶ اگست کو سویرے ہی اُنھوں نے اوپر آکر مانک لال بھائی سے کہا کہ اگر آج شام کے لیے آپ کہیں چلے جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ لیکن مانک لال جی بڑے نڈر آدمی تھے۔ اُنھوں نے جواب دیا "ارے ایسی کیا بات ہے، آپ سب لوگ ہیں ہی۔ پھر ہم کو کیا خطرہ ہے؟"

دونوں بھائیوں نے کچھ دیر اُن سے اصرار کیا، پھر چُپ چاپ واپس چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مانک لال بھائی چھجّے پر کُرسی ڈال کر باہر کا تماشہ دیکھنے لگے۔

دھیرے دھیرے دوپہر کے دو بجے اور ہوا میں کچھ گرمی سی محسوس ہونے لگی۔ تین بجے کے قریب ہڑتالیوں کا ایک بڑا جلوس نکلا۔ اس جلوس نے راستہ چلتے ہندو مسافروں کو مارنا شروع کر دیا۔ کچھ مکانوں دوکانوں میں آگ بھی لگا دی۔ کچھ ہی دیر میں اس جلوس کا ایک حصّہ مانک لال بھائی کے مکان کے سامنے آپہنچا۔

اُس وقت محمود اور رمضان دونوں بھائی اپنی بند دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر جلوس آگے بڑھ گیا۔ اب محمود اور رمضان نے اوپر جاکر مانک لال بھائی سے پھر وہنے کی کہ آپ کہیں دوسری جگہ چلے جائیے۔ ابھی موقع ہی اور ہم آپ کو نکال سکتے ہیں لیکن یا تو مانک لال بھائی کے سر پر ہونی سوار تھی اور یا باہر نکلنے کے بجائے اُنکو گھر پر رہنا زیادہ محفوظ معلوم ہوا، اسلئے اُنھوں نے دونوں بھائیوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ آپ کے رہتے ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہی۔

اُس وقت مانک لال بھائی نے شاید ہی یہ سوچا ہو کہ اس رسمی جواب سے دونوں بھائی اپنے اوپر کتنی ذمہ داری سمجھ رہے ہیں۔

دوپہر کسی طرح کٹی اور شام ہونے لگی۔ قریب پانچ بجے مانک لال بھائی نے محسوس کیا کہ ایک جلوس پھر اُنکے مکان کی اُدھر آرہا ہی۔ اُنکا لڑکا اور لڑکی جلوس کو دیکھنے باہر چھجّے پر جا کھڑے ہوئے۔ جلوس نے بھی ان بچوں کو دیکھا اور فوراً ہی جلوس سے آوازیں آنے لگیں "یہ تو ہندو ہیں۔ انکو نیچے لاؤ۔ یہ کافر کے بچّے یہاں کیسے بیٹھے ہوئے ہیں؟"

مکان کے نچلے حصّے میں جو مسلمان کرایہ دار تھے، اُنھوں نے بھیڑ کو سمجھانا چاہا، لیکن مذہب کے دیوانے کبھی ایسی بیکار کی باتیں نہیں سنا کرتے۔ رمضان اور محمود اُس وقت کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے، اس لیے بھیڑ دھڑ دھڑاتی ہوئی اوپر چڑھ گئی اور دروازے کو ڈنڈوں سے پیٹنے لگی۔ یہ دیکھ کر مانک لال بھائی نے دروازہ کھول

دیا اور کڑک کر بولے "کیا بات ہے؟ اتنا شور کیوں مچاتے ہو؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

بھیڑ میں سے ایک نے چیخ کر کہا "پکڑو سالے کو۔ بڑا شریف بنا پھرتا ہے۔ مار ڈالو" لیکن کسی دوسرے آدمی نے اُس گنڈے کا اُٹھا ہوا ہاتھ تھام کر کہا "نہیں اُن سے تو پیسہ لینا ہے۔ مار کر کیا ملے گا؟"

مانک لال نے پانچ سو روپئے دیکر اس بھیڑ سے اپنی جان بچائی۔

بھیڑ کے وہاں سے جانے کے بعد ہی محمود گھر لوٹا اور راستے میں کھوج خبر لینے کے لئے وہ مانک لال بھائی کے بھی گھر آ پہونچا۔ یہ گھٹنا سُن کر اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اب مانک لال بھائی جانے کو تیار بھی تھے، پر اب سواری ملنا ناممکن تھا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ اب تو گھر میں ہی بیٹھا جائے۔

رات ہونے ہی محمود پھر آیا اور اُس نے مانک لال بھائی کے گھر ہی سونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن ایسے بلوے کے وقت مانک لال بھائی نے محمود کو اُس کے خاندان سے دور رکھنا زیادتی سمجھی اور اُسے گھر واپس بھیج دیا۔ اس طرح جب پورے کلکتے میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے پر حیوانوں کی طرح چھُری پھیر رہے تھے، اُس وقت مانک لال جی اور رمضان و محمود کے بیچ اس طرح کی پریم کی ڈوری کھینچا تانی چل رہی تھی۔ حالانکہ دونوں کے بیچ کوئی پچھلی جان پہچان تک نہ تھی۔

یہ رات مانک لال بھائی نے جاگتے ہی کاٹی۔ صبح ہوئی اور

جیوں جیوں سورج چڑھتا گیا، تیوں تیوں، مار و کاٹ کی آوازیں اور بے بسوں کی چیخ پکار بھی بڑھتی ہی گئی۔ آج ہندوؤں نے بھی اپنے جوہر دکھلانے شروع کر دیئے تھے۔ دلیل یہ تھی کہ بلوائی مسلمانوں سے اپنی حفاظت کا صرف یہی علاج ہے۔ لیکن تماشہ یہ تھا کہ بلوائی مسلمان اپنے حلقے میں گھرے ہوئے جن ہندوؤں کو نقصان پہنچا سکتے تھے، اور پہنچا رہے تھے، وہاں ان 'دیہ ہندوؤں' میں سے کوئی جھانکتا بھی نہیں تھا اور اپنے حلقے میں گھرے ہوئے جن اِکّے دُکّے مسلمانوں پر یہ اپنی ویرتا دکھا رہے تھے، وہ مسلمان چاہ کر بھی ہندوؤں کو قطعی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ خود بلوہ پسند مسلمان بھی یہی چاہتے تھے کہ ہندو حلقوں میں گھرے ہوئے مسلمان مارے جائیں، جس سے اُن 'غدّار مسلمانوں' کا منہ بند کیا جا سکے جو اُن کو لوٹ مار کرنے سے منع کرتے تھے۔ اس وقت دونوں طرف کے غنڈوں کے پَو بارہ تھے اور اس نایاب موقع سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا لینا چاہتے تھے۔ اسی لئے ہندو اور مسلمان دونوں میں ایسی افواہوں کا زور تھا، جس سے بلوہ اپنے اصلی رُوپ سے سَو گنا زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ یہ افواہیں دونوں طرف کے جوش کو اُبھارنے میں شراب کا کام دے رہی تھیں اور جو لوگ ان افواہوں پر یقین نہ کرنے کے لئے سمجھاتے تھے، وہ سب 'غدّار' قرار دے دیئے گئے تھے۔

اس دِن مانک لال بھائی کے مکان پر پھر ایک حملہ ہوا اور مانک لال بھائی نے کپڑے اور برتن دیکر اپنی جان بچائی۔ مانک لال

بھائی سمجھ گئے کہ اب جان بچنی مشکل ہی ہے۔

اسی دن، یعنی ۷ اگست کو شام کے پانچ بجے ایک بھیڑ بھر مانک لال بھائی کے مکان پر پہنچی۔ دروازے پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔ بہت سے مسلمان پڑوسی بھیڑ کی خوشامد کر رہے تھے، لیکن اُن کو ڈانٹ دیا گیا اور وہ چپ چاپ الگ کھڑے ہو گئے۔ مانک لال بھائی نے یہ خیال کر کے کہ دروازہ تو ٹوٹ ہی جائے گا، خود ہی دروازہ کھول دیا۔ اُنکی سولہ برس کی لڑکی اپنے باپ کی حفاظت کے لئے مانک لال بھائی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے دیکھ کر مذہب کے دیوانے گندی سے گندی باتیں کرنے لگے۔ مانک لال، بھائی بے بس بنے یہ سب سُن رہے تھے۔ کچھ منٹوں کے بعد گنڈوں نے صلاح کی کہ پہلے اس بڈھے کو تو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ عورتوں کا بٹوارہ پیچھے ہو جائے گا۔ اب بھیڑ نے مانک لال بھائی کو باہر کھینچنے کی کوشش کی ہی تھی کہ دو مسلمان نوجوانوں نے بھیڑ کو چیر کر راستہ روک لیا اور گرج کر بولے "خبردار! جو کسی نے ہاتھ لگایا! مال چاہیے تو مال لے جاؤ، لیکن ان بے بس انسانوں پہ ہاتھ نہیں ڈال سکو گے!"

یہ محمود اور رمضان تھے، جو مانک لال بھائی کے گھر پہ حملہ ہونے کی خبر سُن کر اپنے گھروں سے بھاگ کر آئے تھے۔

اب بھیڑ سے اور محمود سے بحث ہونے لگی۔ محمود قرآن شریف کے حوالے پر حوالے دے رہا تھا کہ اُس میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے پڑوسیوں اور دوسرے مذہب کے لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنے کا سبق دیا

ہی اور بھیڑ ہندوؤں کے ظلموں کی مثالیں دے رہی تھی۔ محمود کہتا
تھا کہ جن ہندوؤں نے ظلم کیا ہے، اُن سے چل کر لڑو اور میں
تمہارا ساتھ دوں گا، اس پر بھیڑ بھڑک اُٹھی۔ کچھ نوجوانوں نے
لوہے کے موٹے ڈنڈوں سے محمود کو پیٹ کر نیچے گرا دیا۔ مذہب
کے کام میں جو رکاوٹ ڈالے، بھلا اُسے زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟
کچھ ہی دیر میں محمود کی خون سے لت پت لاش پڑی ہوئی تھی۔

رمضان نے اپنے بھائی کو اس طرح گرتے ہوئے دیکھا اور
سمجھ لیا کہ اگر اُس نے بھیڑ کو روکا تو اُسکی بھی یہی حالت ہوگی۔ پھر
بھی بجلی کی تیزی سے جا کر اُس نے ماں، بیٹے اور بیٹی کو ایک کمرے میں بند
کر دیا اور خود اس کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھیڑ جیسے
ہی آگے بڑھی، اُس نے اپنے راستے میں رمضان کی شکل میں
اس دیوار کو پایا۔ لیکن دھرم اور دین کے دیوانے کہیں ایسی مشکلوں
کو مشکل سمجھتے ہیں؟ فوراً ہی رمضان پر بھی وار ہونے لگے اور
کچھ ہی دیر میں وہ بھی اپنے بھائی سے جا ملا۔ مانک لال بھائی کا سب
پریوار اب باندھ لیا گیا اور اُن کو نیچے سڑک پر لے جایا گیا،
جس سے کہ اُن سب کو ذرا تڑپا تڑپا کر مارا جا سکے۔ کم سے کم
ایک دوسرے کے قتل کو تو وہ دیکھ ہی سکیں۔ بہادری کا جذبہ
اس وقت اپنی آخری حد پر پہنچا ہوا تھا۔

مانک لال بھائی اور اُن کا سب خاندان سڑک پر کھڑا کر دیا
گیا۔ اب بحث یہ تھی کہ پہلے کسے ٹھکانے لگایا جائے۔ باپ کو یا بیٹے
کو؟ ماں اور بیٹی کو تو قتل کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اُن کو

تو صرف یہ تماشہ دکھانا تھا۔ یہ بحث کسی فیصلے پہ پہنچی ہی تھی کہ فوجی لاریوں کی گڑگڑاہٹ گونج اٹھی اور گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہیں، ان آوازوں کا آنا تھا کہ مذہب کے دیوانے دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ رمضان اور محمود کے سمجھانے پر اور قرآن شریف کے حوالوں پر جو نہیں ماننا چاہتے تھے، اُنکی بہادری کا تمام جوش بندوق کی ایک آواز نے ٹھنڈا کر دیا۔ اس طرح مانک لال بھائی اور اُن کا خاندان موت کے کنارے پہنچ کر بھی بچ گیا۔

فوجیوں نے اس خاندان کو اپنی لاریوں پر چڑھایا، لیکن تبھی مانک لال بھائی کی بیوی لاری سے اُتر کر اوپر کی اور بھاگیں۔ فوجیوں نے اُن کو روکنا چاہا تو اُنھوں نے بیچینی سے کہا کہ میرے دو بیٹوں کی لاشیں تو اوپر پڑی ہیں۔ ارے اُن کو ایک بار آنکھ بھر کر دیکھ تو لینے دو۔

فوجیوں کو دیا آ گئی اور وہ پورے خاندان کو اوپر لے گئے۔ وہاں یہ خاندان محمود اور رمضان کی لاشوں پہ اس طرح بلکھ بلکھ کر رویا کہ کچھ دیر کے لئے مکان کی دیواریں بھی پگھلنی جان پڑیں۔ نیچے کے مسلمان پڑوسی حیران تھے کہ جب پورا خاندان بچ گیا ہے، تب اس طرح 'ہائے ہائے' کیوں مچا رہا ہے، اُنھوں نے اندازہ لگایا، شاید مال کے لئے۔ ہاں، سچ مچ مال کے لئے، پر یہ تو وہ بعد میں جان پائے کہ یہ مال، کس طرح کا تھا اور کتنا قیمتی تھا۔

پھر یہ پریوار بڑا بازار کے تھانے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پانچ دن رہنے کے بعد اُسے ایک دوست کے یہاں پناہ مل گئی۔

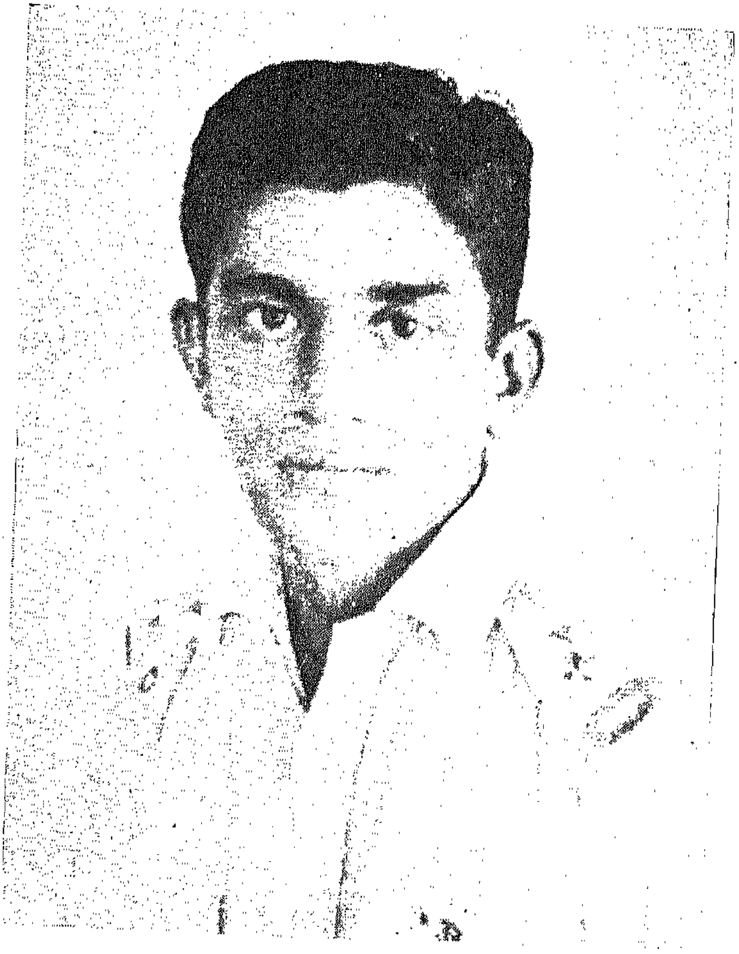
آج بھی مانک لال بھائی اور اُن کا پورا خاندان کلکتے میں ہی ہے۔ جب بھی ۱۶ اگست آتی ہے، مسلمانوں کے ذریعے برباد ہوئے اس خاندان کے دل میں دو مسلمان نوجوانوں کے لئے آنسو اُمنڈ پڑتے ہیں، جنکی وجہ سے وہ آج بھی اس دنیا میں ہیں۔ ماں اور بیٹی تو یہ سوچ کر ہی کانپ اُٹھتی ہیں کہ اگر رمضان اور محمود اپنی جان دیکر اُن کی حفاظت نہ کرتے تو آج اُن کی کیا گت ہوتی۔

محمود کی دوکان ابھی آج وہیں پر ہے۔ اُس پر رمضان اور محمود کی پیاری شکلیں اب نہیں دکھائی دیتیں، پر جب کبھی وہاں سے نکلتی ہوں، کوئی یہ کہتا جان پڑتا ہے —

"بہن! مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اسلام کیا ہے، اسکا اندازہ اُن لوگوں سے مت لگانا، جو اُس وقت تمہارے عزیزوں کی جان اور عزت کے گاہک ہو رہے تھے۔ اسلام کی تعلیم کا ایک چھوٹا سا نقشہ ہم نے اپنے خون سے کھینچ دیا ہے اور سچ مانو کہ اسلام کی سچی تعلیم یہی ہے۔"

اور مجھ میں تو طاقت نہیں کہ اپنے اِن دونوں شہید بھائیوں کے اس سندیش کو ماننے سے انکار کرسکوں۔

آج کے شہید



شری بسنت راؤ ھینگشٹے

بابا صاحب بسنت راؤ ہنگشٹے

[احمد آباد میں جب ہندو دھرم اور دین کے نام پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے تھے اور کایروں کی طرح اندھیری گلیوں میں چھپرے بازی کر رہے تھے، تب دادا بسنت راؤ ہنگشٹے اور شری رجب علی نام کے دو نوجوان دوستوں نے اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے انمول پرانوں کا دان دیا تھا۔ سچائی اور اہنسا کی "تلوار" لے کر یہ دونوں جیون مرن کے ساتھی اپنے پیارے ہندو دھرم اور اسلام کی لاج بچانے کے لئے انسان کا خون بہانے والے گنڈوں کے مقابلے میں اچل روپ سے آ کھڑے ہوئے تھے اور پھر ہنستے ہنستے شہید ہو گئے تھے۔ ان دونوں شہید بھائیوں کی کتھا بسنت راؤ جی کی سگی بہن شریمتی ہیم لتا ہنگشٹے نے اپنے آنسوؤں سے گجراتی میں لکھی ہے، جس کا نیچے دیا ہوا آزاد ترجمہ وِجے گڑھ (علی گڑھ) کے ایک بزرگ شری ب۔ روپ کشور جی جین نے کیا ہے۔ احمد آباد کے دوستوں نے تو ان شہیدوں کی یاد میں گجراتی

اور مراٹھی زبان میں ایک بڑی کتاب نکالی ہے، جس میں ان شہیدوں کے مختلف دوستوں اور عزیزوں نے انکی شہادت پر اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھائے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم ان شہیدوں کی قیمت کو سمجھیں اور جہاں جہاں اس طرح کی گھٹنائیں ہوئی ہوں، وہاں پر مقامی طور پر اسی طرح کی کتابیں بڑی تعداد میں نکالی جائیں۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کے وقت، جب ہم حد درجہ کی کمینی کاپرتا کو بہادری، سب سے بڑے پاپ کو دھرم اور سب سے بڑی غداری کو دیش بھکتی سمجھ کر اپنے دیش، دھرم اور انسانیت کی جڑیں تک کھود ڈالنے کے لئے تھے، تب ہماری گالیاں کھاتے ہوئے بھی ہم کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش میں اپنی جان تک قربان کر دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ تو جلتے جی اپنے کو آگ میں جھونکنا تھا۔ ایسی اونچی قربانی اور شہادت کا جذبہ ان میں کیسے پیدا ہو سکا، اسکا جواب ان شہیدوں کی، خاص طور پر بابا صاحب بسنت راؤ ہنگنشے کی یاد میں لکھے گئے اُن کی بہن کے اس لیکھ سے مل جاتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بسنت راؤ جی ایک بڑے دیش بھکت ہونے کے ساتھ ساتھ کتنے بڑے ایشور بھکت تھے اور اُن کو اپنے ہندو دھرم پر کتنا گہرا یقین اور اسکے لئے اپنے دل میں کتنا ابھیمان تھا، میں ہیم لتاجی کے اس لیکھ کے لئے بیں اُن کا احسان مند ہوں۔

— سمپادک

بھیا بسنت راؤ ہنگنشٹے کی یاد میں

(بہن ہیم لتا ہنگنشٹے)

بسنت راؤ کو گھر کے تمام لوگ بابا صاحب کہتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بسنت راؤ عقل اور دھیرج میں ہم سبھی سے بڑھ چڑھ کر تھا بھی۔ آج اُن کی یاد کو اکسانے والی بہت سی گھٹناؤں کو نظر انداز کرکے میں صرف کچھ گھٹنائیں لکھ رہی ہوں۔ ایک بار ہماری دادی ماں بیمار تھیں۔ اُس وقت بابا صاحب جیل میں تھے۔ یہ بات جون سنہ ۱۹۳۰ء کی ہے۔ دادی ماں کو بابا صاحب سے بڑا پریم تھا اور ساتھ ہی، بڑی ہوتے ہوئے بھی، وہ اُسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں، کیونکہ بابا صاحب بہت ہی چست، جوشیلے اور کٹر گاندھی بھگت تھے۔ چونکہ بابا صاحب ستیا گرہ میں بھاگ لے رہے تھے، اس لئے بہت سے لوگ اُن کی بڑی عزت کرنے لگے تھے۔ ایک دن میری طبیعت بہت بگڑی۔ سوچا، دادی ماں شاید اس بار نہیں بچیں گی۔ دادی ماں کہتی تھیں

"اب ہمارا سادھو جلد ہی چھوٹنے والا ہے۔ مجھے کیسی ہی تکلیف ہو لیکن انت کال میں تو مجھے شانتی ہی ملے گی"۔ ہوا بھی یہی۔ بابا صاحب جیل سے چھوٹے نہیں کہ دادی ماں کا پران پکھیرو اُڑ گیا۔ ایسا لگا جیسے بابا کے چھوٹنے کی خبر کے انتظار میں ہی اُنکے پران اٹکے ہوئے تھے۔ بابا صاحب کو دادی ماں کیا ہم تمام گھر کے لوگ ایسے ہی پیار اور شردھا کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دوسری بات، جو مجھے آج بار بار یاد آتی ہے، اُس وقت کی ہے، جب میں چار برس کی تھی۔ تب گاندھی جی ڈانڈی یاترا کو جا رہے تھے اور اُنکے ساتھ جانے والوں میں سے ایک ہمارے پتا جی بھی تھے۔ لیکن ایسی بھیڑ میں مجھے بھلا کون لے جاتا؟ میری خود کسی سے کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی لیکن رات کو میں نے بابا صاحب سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا مجھے بھی کل اس یاترا کو دکھا دو گے؟" بابا صاحب نے ترنت میری بات مان لی۔

دوسرے دن بابا صاحب کے ساتھ میں یاترا دیکھنے چلی تو آسانی سے گاندھی جی کے پاس تک پہنچ گئی۔ پیچھے تو لاکھوں کی بھیڑ ہو گئی۔ آخر اتنی بھیڑ ہو گئی کہ چلنا مشکل ہو گیا۔ اس پر کٹھنائی یہ تھی کہ ہمیں ندی پار کرنی تھی، جس میں کانٹے اور کنکر پتھر بہت تھے۔ پھر بھی بابا صاحب مجھے ندی پار تک لے ہی گئے۔

دوسروں کو سکھی دیکھنے اور اُن کی اِچھا پوری کرنے کیلئے بابا صاحب شروع سے ہی کبھی اپنے نجی سُکھ دُکھ، سویدھا اسویدھا کا خیال ہی نہیں کرتے تھے۔

جب ہم بھائی بہن اور گھر کے دوسرے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتے تھے، تب بابا صاحب جس دھیرج سے ہماری باتیں سنتے تھے اور جس میٹھے پن اور عقلمندی سے اُس کا جواب دیتے تھے، اُسکی یاد آتے ہی آج بھی میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔

بابا صاحب کے بچپن کی ایک گھٹنا بھی لکھنے کے لائق ہے۔ جسے یاد کر کرکے اُن کی زندگی میں وہ خود اور ہم سب خوب ہی ہنستے تھے، لیکن آج تو وہ بھی ہماری آنکھوں میں پانی ہی لاتی ہے۔

گھٹنا یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک ماسٹر تھے، جنکی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے ودّیارتھیوں کو عجیب عجیب ناموں سے پکارتے تھے، جس سے ودّیارتھی بہت شرماتے اور چڑھتے تھے۔ بابا صاحب بچپن میں شریر سے بیحد دُبلے پتلے تھے، اسلئے ماسٹر صاحب اُن کی تندرستی کا ہی مذاق اُڑایا کرتے تھے اور اُن کو پیٹتے بھی بہت تھے۔ اس پر بابا صاحب کو اپنی تندرستی ٹھیک کرنے کی دھن سوار ہوئی۔ جب ہم سب اُن سے اس بارے میں پوچھتے تو وہ کہتے کہ چھ مہینے کے بھیتر بھیتر مجھے اس ماسٹر کو ضرور پیٹنا ہے۔ اسکے لئے اپنے شریر کو تندرست کر رہا ہوں۔ بابا صاحب کا یہ خیال پورا نہیں ہو سکا کیونکہ بھگوان نے یہ میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی بابا صاحب سے اُنکی حفاظت کرنے کے لئے ماسٹر صاحب کو اپنے پاس بُلا لیا لیکن بابا صاحب کی وہ دھن جاری رہی اور آخر میں تو اُن کا شریر اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ وہ موٹر کو اپنی چھاتی پر سے اُتار لیتے تھے۔

اسی طرح ایک بار اُن کو تلوار چلانا سیکھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اُسکا ابھیاس کرتے ہوئے ایک بار اُنکو تلوار کا زخم لگ گیا۔ جو اُستاد اُن کو تلوار گھمانا سکھاتے تھے وہ بھی اس زخم کو دیکھ کر سہم گئے اور انھوں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے اُن کو آرام کرنے کی صلاح دی۔ لیکن بابا صاحب اسی طرح کام کرتے رہے، جسے دیکھ کر ڈاکٹر بھی چونکتا رہ گیا۔ بابا صاحب تب کہا کرتے تھے کہ شریر مضبوط ہوتے ہیں، میرا من بھی مضبوط ہو گیا ہے۔

اگر وہ اپنے من میں کبھی کوئی کمزوری پاتے تھے تو اُس پر اُنکو بڑی شرم محسوس ہوتی تھی۔ ایک بار جیل میں اُن کو ملیریا ہوا۔ ڈاکٹروں نے اس پر کُنین دی، لیکن بخار چھوٹتا ہی نہیں تھا۔ اس پر بھی بابا صاحب خود ہی پاخانہ وغیرہ کی ضرورتوں سے فارغ ہو لیتے تھے۔ کسی دوسرے کو اپنے لئے تکلیف دینا انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں سردی لگ گئی اور اُن کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب وہ اپنے گھر زندہ نہیں لوٹ سکیں گے۔ یہ خیال کرکے ایک بار اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن دوسرے دن جب بخار کچھ کم ہوا تب اُن کو اپنے من کی اس کمزوری پہ بڑی شرم آئی۔ اس طرح سے اپنی کمزوریوں کی وہ ہمیشہ کڑی جانچ پڑتال کرتے تھے، تبھی تو وہ اس بھیانک آگ میں ایسی آسانی سے کود گئے جیسے پھولوں کی ویدی پہ بیٹھ رہے ہوں۔

کبھی کبھی وہ بڑی انوکھی باتیں کر دکھاتے تھے۔ اسی جیل میں ہونے والی ملیریا کی کہانی ہے۔ اُس نے اُن کو پھر جیل سے

چھوٹنے پر بھی نہیں چھوڑا۔ ہمارے گھر میں ڈاکٹری دوا بہت ہی کم آتی ہے اور قدرتی علاج پر ہی سب کا یقین ہے۔ بابا صاحب کا بھی اسی ڈھنگ سے کافی علاج ہوا، لیکن جوڑی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس پر آب و ہوا بدلنے کے لئے وہ رتناگری چلے گئے، لیکن پورے ڈھائی مہینے تک وہاں رہنے پر بھی اُنکی صحت میں سُدھار نہیں ہوا۔ آخر پھر واپس احمد آباد آگئے اور جب ایک دن اس روز روز کی جوڑی سے بہت پریشان ہوگئے تو لنگوٹی مار کر ایک پتھر پر جا بیٹھے اور پرانا یام کرتے ہوئے تمام رات اُسی پتھر پر بیٹھے رہے۔ بس اُسی دن سے اُن کو جوڑی کا آنا بھی چھوٹ گیا۔

ہمارے دادا بڑے ایشور بھگت تھے۔ اُن کی اس وراثت کو بابا صاحب نے پوری طرح سنبھالا اور اُسکی حفاظت کی۔ دادا جی کی کتابوں میں سے 'رامائن'، مہابھارت، وغیرہ نکالکر وہ بچپن سے ہی پڑھا کرتے تھے۔ لیکن کسی بات پر آنکھ میچ کر یقین کر لینے کی عادت اُن میں نہیں تھی۔ وہ جب چھوٹے سے تھے تو رامائن پڑھتے وقت اکثر پتا جی سے "رام نے سیتا کو کیوں چھوڑ دیا تھا؟" جیسے سوال پوچھ بیٹھتے تھے۔ ہر ایک بات کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کی عادت اُن میں آخر تک رہی۔

ہمت تو اُن میں غضب کی تھی۔ ستیا گرہ کے زمانے میں میٹھا نگر کی چھاؤنی پر پولیس نے جب حملہ کیا تب بابا صاحب نہتے ہی پولیس کی لاٹھیوں کے سامنے جم گئے۔ گھر میں خبر آئی کہ

بہت چوٹ لگی ہے۔ دادی اماں تو اس خبر کو سُن کر رونے لگیں اور ایشور سے پرارتھنا کرنے لگیں کہ "ہے پربھو! اس بالک کی رکشا کرنا۔ پروپکار کے کام میں گیا ہے۔ سو اُسے جیتا جاگتا واپس لے آنا۔ پربھو نے پرارتھنا سُن لی اور بابا صاحب کو جیسے دوسری زندگی ملی۔ وہ جب گھر واپس آئے اور کپڑے اُتار کر نہانے بیٹھے تو چوٹوں سے کالے پڑے ہوئے اُن کے شریر کو دیکھ کر سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر بابا صاحب ہنسکر بولے "بھلا لاٹھی کی مار کھا کر اسٹریچر پہ مزے میں سو جانے میں بھی کچھ محنت پڑتی ہے۔ لاٹھی کھانے میں تو بڑا مزہ آتا ہے اور دیش کے کام کی لگن بھی بڑھتی ہے۔"

بابا صاحب کے سُبھاؤ کی اُدارتا کی بھی ایک گھٹنا لکھ دوں۔ ایک بار بابا صاحب کی سونے کی گھڑی بابا صاحب کے پاس رہنے والے ایک سویم سیوک نے چرا لی۔ ہمارے مکان میں مانک لال نام کے ایک کرایہ دار رہتے تھے۔ وہ فوراً تاڑ گئے کہ گھڑی اُس سویم سیوک نے لی ہے۔ لیکن بسنت راؤ کے ڈر سے وہ اس سے کچھ زیادہ پوچھ تاچھ نہ کر سکے۔ لیکن جب بابا صاحب باہر گئے تب مانک لال نے اُس سویم سیوک کے سامان کی تلاشی لی اور اُسکے چرخے میں جہاں روئی کی پونیاں رکھی تھیں، وہاں سے گھڑی برآمد کر دکھائی۔ اسکے بعد مانک لال نے اُس سویم سیوک کو خوب لعنت ملامت کی پر بسنت راؤ نے اُس سے ایک شبد بھی نہیں کہا۔ کچھ دنوں بعد بابا صاحب پھر اُسی آدمی کو بڑے پریم سے اپنے گھر لائے اور کھانا کھلایا۔ دوسرے دن

کے بارے میں وہ ہمیشہ اسی طرح کی بھاؤنائیں ظاہر کرتے تھے۔

بابا صاحب کو طرح طرح کی کلاؤں میں بھاری دلچسپی تھی۔ ہمارے یہاں گنیش جی کا تیوہار منایا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء تک بابا صاحب اپنی گنیش جی کی مورتی کو بڑی سندرتا سے سجاتے تھے، گانے، بجانے، تصویریں بناتے، ابھینے کرنے میں انھوں نے خاصی ترقی کی تھی۔ قدرتی علاج میں انھوں نے ابھیاس کیا تھا اور گھر میں کوئی بیمار پڑتا تھا تو بڑی لگن سے اُس کا علاج وہ خود ہی کرتے تھے، جس میں اُنکو سو فیصدی کامیابی ہوتی تھی۔

بابا صاحب کو کشتی لڑنے کا بھی شوق تھا۔ کئی اچھی کشتیاں اُنھوں نے جیتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی کمزور اور معمولی پہلوان کو ہمت دینے کے لئے اُس سے جان بوجھ کر ہار بھی جاتے تھے۔ ہمارے دیش کا بچہ بچہ مضبوط بنے، یہی لگن اُن کو دن رات رہتی تھی۔ گھر میں جب کوئی اچھوت آتا تھا تو وہ اُسے پرنام کرتے تھے۔ جات پات کا بھید بھاؤ تو اُن کے دل میں نام کو بھی نہیں رہا تھا۔ ایک بار جیل سے ایک پٹھان کو وہ ایسا دوست بنا کر نکلے کہ اگر پٹھان سے کوئی اُن کی بابت پوچھتا تو پٹھان بتاتا کہ میں اُنکا نوکر ہوں۔ وہ جس سے ایک بار مل لیتے تھے، بس وہ اُن کا ہی ہو جاتا تھا۔

آخر ۷ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کا دن بھی آیا۔ شہر بھر میں اُن دنوں بھاری مار کاٹ مچ رہی تھی لیکن رجب بھائی کے ساتھ بابا صاحب باہر کو چلے۔ کسی نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" تو

بابا صاحب نے کہا "میرے راستے میں روڑے نہ بنو۔ جہاں میری ضرورت ہے، وہاں میں ضرور جاؤں گا۔"

قریب ساڑھے پانچ یا چھ بجے بابا صاحب گھر لوٹے۔ وہ پانی پینے کے لئے آئے تھے۔ میں ابھاگن پوچھ بیٹھی "کانگریس ہاؤس میں کیا پانی پینے کو نہیں تھا ہے؟" اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر چل دینے کے لئے چپل پیر میں ڈال رہے ہیں۔

اس کے گھنٹہ بھر بعد سات ساڑھے سات بجے یہ دل دہلانے والی خبر ملی جسے سُن کر ہم سب نے سر پیٹ لیا۔ ہم سب فوراً ہسپتال پہنچے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ اُن کا سونے کا شریر نرجیو ہوا پڑا ہے۔ چہرے پر کوئی ڈر تھا نہ رنج۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ ان کو موت کے ساتھ بھی ہنسی مذاق سوجھ رہا تھا۔

اس طرح ہمارا بابا صاحب ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا۔ وہ ہنستے ہنستے سدا کے لئے سو گیا اور ہم ابھاگے زندگی بھر رونے کے لئے باقی رہ گئے۔

"میں کا ریہ کرتا۔ دو ہندو اور ایک مسلمان۔ دنگا مٹانے کے خیال سے گئے اور اسی کوشش میں کام آ گئے۔ مجھے اُن کی موت کا دُکھ نہیں ہوتا۔ رلائی نہیں آتی۔ اسی طرح شری گنیش شنکر ودیارتھی نے کانپور کے دنگے میں اپنی جان قربان کی تھی۔

دوستوں نے ان کو روکا اور کہا تھا۔ دنگے کی جگہ نہ جائیے۔ وہاں لوگ پاگل ہوگئے ہیں۔ وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔ لیکن گنیش شنکر ودیارتھی اس طرح ڈرنے والے نہیں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے جانے سے دنگا ضرور رکے گا۔ وہ وہاں پہنچے اور دنگے کے جوش میں پاگل بنے لوگوں کے ہاتھ مارے گئے۔ ان کی موت کا سماچار سن کر کسے خوشی ہی ہوئی تھی۔ یہ سبق میں آپ کو ڈرانے کے لئے نہیں کہتا۔ ہاں تو آپ کو یہ سمجھاتا بتاتا ہوں کہ آپ مرنے کا سبق سیکھ لیں تو سب ٹھیک ہی ٹھیک رہے۔ اگر گنیش شنکر ودیارتھی، ہمنت راؤ اور رجب علی جیسے کئی لوگ نکل پڑیں تو دنگے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتے ہیں۔

[illegible]

رجب بھائی

(بہن ہیم لتا ہنگنٹے)

رجب علی کو ہم رجب بھائی کہتے تھے۔ وہ صرف ایک مہینہ ہی ہمارے گھر پہ رہا تھا، لیکن اتنے تھوڑے وقت میں ہی وہ ہم سب میں ایسا ہل مل گیا تھا کہ ہم سب اُسے اپنے گھر کے ہی آدمیوں میں شمار کرتے تھے۔ اسکے بعد وہ اپنے ایک دوست کے یہاں چلا گیا، جو نترنگ پور میں رہتے تھے۔ لیکن ہمارے یہاں وہ اُسی نیم سے آتا تھا۔ اکثر جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا، تو "یہ چیز کس نے پکائی ہے، اس میں کون کون سے وٹامن ہیں؟" وغیرہ سوال کیا کرتا تھا، جس میں خاصا ہنسی مذاق رہتا تھا۔

ہم سب کبھی رات کو ایک ساتھ بیٹھکر گپ شپ کیا کرتے تھے۔ رجب بھائی کی عادت تھی کہ اُس گپ شپ کے بیچ وہ گنت کے پیچیدہ سوال پوچھا کرتا۔ جب ہم لوگ اُن سوالوں کا جواب نہ دے پاتے تو اُنکو بڑے اچھے ڈھنگ سے سمجھاتا تھا۔ فضول کی گپ شپ میں بھی ہم کو کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنا چاہئے شاید اسی بھاؤ سے وہ ایسا کرتا تھا۔

سپنوں کے بارے میں وہ بڑی دلچسپی سے بات کرتا تھا۔ اس بارے میں اُس نے کافی پڑھا اور کافی وچار کیا تھا۔ اسی لئے جب سپنوں کے بارے میں وہ بات چیت کرنے لگتا تو ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا پنڈت بول رہا ہے۔ سپنے کیوں آتے ہیں، اُن کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، یا قدرت کے ساتھ اُن کا کیا تعلق ہے، یہی سب باتیں وہ بڑی صفائی کے ساتھ اس طرح سمجھا دیتا کہ ایک معمولی بچہ بھی سمجھ جائے۔ اسکی پڑھائی کو دیکھ کر ہم سب تعجب کرتے تھے۔

ہمارے گھر آتے ہی وہ پہلے ہماری ایک بہن بجوف کو تلاش کرتا تھا کیونکہ وہ بڑی شیطان تھی۔ اسکے بعد ایسی کھینچا تانی اور بھاگ دوڑ ہوتی کہ ہنستے ہنستے پیٹ پھول جاتا تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رجب بھائی ہمیشہ کھلاڑی بن رہا۔ خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے کے لئے ہی جیسے وہ ہمارے گھر آتا تھا۔

۱۴ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کو ہمارے گھر جب بسنت کا تیوہار منایا گیا تو اُس میں رجب بھائی کو بھی بلایا گیا۔ اُس دن وہ رات کو بھی گھر پر ہی رہا اور ہم سب بڑی دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اُس وقت ہم میں سے کون جانتا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں ہم اپنے اس پیارے بھائی کی صورت دیکھنے کے لئے بھی ترسا کریں گے اور یہ ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاوے گا۔

آج بھی اس کی یاد ہمارے دل میں ٹیس سی پیدا کر دیتی ہے۔

پرتگیا

شچین دا

آنکھوں کے آگے سے تیری چمکیلی صورت کھسک گئی
پر دل کے کونے میں گھس کر وہ آج اور بھی چپک گئی
کتنی چاہ نرالی ایک سورگ کا راج بسانے کی بھاری
بن گئی تمھاری قربانی اُس راج محل کی تالی
ہاتھوں میں لیکر پھول اور آنکھوں میں یہ آنسو بھر کر
آئیں گے سب ملکر شہید کی،
اِس انوپم پاون سمادھی پہ
جو لگا دیا ہے تو نے اپنے خون سے،
یہ لال تلک ہم لوگوں کے ماتھے پہ
اُسے کبھی مٹنے نہیں دیں گے،
رکھیں گے سر آنکھوں پہ

— پرتاپ کمار بسو

[شہید شچیندر ناتھ کے ایک ساتھی پرتاپ کمار بسو نے اوپر دی ہوئی کویتا بنگلہ میں لکھی تھی۔ اُسکا ہندستانی انوواد بھائی بھگوان میشر نے کیا ہے۔ شہید کے خون کا ہمارے ماتھے پہ جو ٹیکا لگا ہوا ہے، اُسے ہم کبھی نہیں مٹنے دیں گے، یہی پرتگیا ہم سب کو آج کے دن کرنی چاہیئے۔
سمپادک]

شچیندر ناتھ متر

[شچین متر مر کر بھی اَمر ہو گئے ہیں۔ ایسی موت پر دُکھ کی جگہ آنند منانا چاہیے ——————— باپو]

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملنے والی ہندستان کی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے بھارت ماتا کے جن پُتروں نے سب سے پہلے اپنے کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، وہ تھے شری شچیندر ناتھ متر، یکم ستمبر ۱۹۴۷ء سے کلکتے کی سڑکیں جب ہندو مسلم بلووں سے ایک بار پھر بھیانک ہو اُٹھیں اور ڈر، بے اعتمادی و ہتیاؤں کی آگ وہاں دھدھک اُٹھی، تب شچیندر ناتھ اس آگ کو بجھانے کے لئے خود ہی اس میں کود پڑے تھے۔

شری شچیندر ناتھ کی یہ کہانی جتنی دُکھ بھری ہے اُس سے بھی زیادہ وہ ہمارے دیش کو گورو دینے والی ہے۔ بھائی بھائی کے ملاپ کی جو فضا ۱۵ اگست کو دیکھنے میں آئی تھی، وہ ایک پکھوارہ بیتتے نہ بیتتے پھر آپسی پھوٹ اور مار کاٹ میں بدل چلی تھی۔ شانتی اور پریم

آج کے شہید



شري شچیندر ناتھ متّر

کے اوتار گاندھی جی کو بھی پھوٹ پرستوں کے ایک گروہ نے بے عزت کرنے کی کوشش کر کے تمام دیش کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دینے کی جہالت دکھائی تھی. کلکتے کی جنتا اپنے بے بس بھائیوں اور پڑوسیوں کی ہتیا کے پاپ بھرے کام میں پوری طرح ڈوب چلے تھے. باپو نے اس جنتا کو صحیح راستے پر لانے کے لئے انشن شروع کر دیا تھا.

آپسی پھوٹ اور مارکاٹ سے حال میں ہی ملی ہوئی آزادی کو بیکار بنا دینے یا پھر سے کھو دینے کی بھید بھری سازش کی گئی تھی اور وہ کامیاب بھی ہو چلی تھی. اس سازش کو ناکامیاب بنانے اور اپنے بھولے پن و جوش کی وجہ سے اس سازش میں شریک جنتا کو اس پاپ بھرے کام سے ہٹانے کے لئے آزادی کے سچے سپاہیوں کی پکار ہوئی اور تب ہمارے دیش کے اس کٹھن سنگرام میں، جو بدیشی حکومت سے چلنے والی لڑائی سے کہیں زیادہ بھیانک تھا، سب سے پہلے آگے آنے والے شری سچیندر ہی تھے.

شری سچیندر دیش کی پکار کو ان سنا نہ کر سکے. کرتے بھی کیسے؟ جس نے بچپن سے ہی دیش سیوا کے کام میں اپنے تن من کو کھپایا ہو وہ دیش کی درگتی کے وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیسے بیٹھا رہ سکتا تھا. آزادی کی لڑائی میں اگلے مورچے میں رہنے والے سچیندر آزادی کی حفاظت کے لئے لڑی جانے والی اس لڑائی میں بھلا کیسے پیٹھ دکھا سکتے تھے! ان کی زندگی کے ساتھ وہ پورا اتہاس تھا، جس میں اس بہادر نوجوان نے اڑتیس برس کی چھوٹی سی عمر میں

ہی کبھی ودیارتھیوں کے آندولن میں نیتا بن کر، کبھی آزادی کی لڑائی میں ایک سپاہی کی حیثیت سے، کبھی گاندھی جی کے پریم سندیش کے پرچارک کے روپ میں، کبھی سنگٹھن کے میدان میں ایک اچھے سنگٹھن کرنے والے کاریہ کرتا کی شکل میں اور حال میں ہی سماج واد کی نئی دھارا کے اگوا بن کر پورے بنگال کو جگمگائے رکھنے کی ان گنت کہانیاں تھیں۔ اُنکے ان تمام شاندار کاموں کے پورے بیورے کو شاید وہ لوگ تو جان بھی نہ سکیں گے جن کو شری شچیندر سے بھی جان پہچان رکھنے کا سوبھاگیہ پراپت نہیں ہو سکا اور میرے لئے ان سے جان اکشروں میں ان کی زندگی اور ان کے کاموں و اُن کے اونچے خیالات کی تصویر کھینچ دینا بھی ایک مشکل کام ہے، پھر بھی میں اس کے لئے کوشش کروں گا جس سے کہ آگے کی پیڑھیوں کو دیش کے دشمنوں سے دیش کی حفاظت کرنے کا بل ملے اور اس امر شہید کے ساتھ کام کرنے والوں کو اور اُن کے پیچھے چلنے والوں کو اُن کی اُس قیمتی وراثت کا گیان ہو جائے جو وہ اُن کے ہاتھوں میں دے گئے ہیں اور شری شچیندر کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ تمام دیش اپنے اس شہید کی صحیح قیمت جان سکے۔

ضلع چوبیس پرگنہ (بنگال) کے بھیل پور سے نگر گاؤں میں ۳۱ دسمبر سن ۱۹۰۹ء شکروار کے دن شری شچیندر کا جنم ہوا تھا۔ شری شچیندر کے پتا شری نریندر ناتھ متر اپنے زمانے کے ایک مشہور اٹرنی تھے، لیکن شری شچیندر جب صرف چار برس کے تھے، تب اُن کے پتا چل بسے اور شچیندر کے لالن پالن کا تمام بوجھ اُن کی پوجنیہ ماتا جی

پر آ پڑا، جو ایک یوگیہ مہلا تھیں۔

شری شچیندر کو شروع کی تعلیم ٹاؤن اسکول میں ملی۔ اس زمانے میں ہی آپ نے سٹڈی سرکل کھولے تھے، لائبریری قائم کی تھی اور ہاتھ کے لکھے اخبار بھی نکالے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں 'پرویشکا' کا امتحان پاس کر کے کلکتہ کے اسکاٹش چرچ کالج میں اپنا نام لکھا لیا۔ اس زمانے میں آپ نے ودیارتھیوں کے سنگٹھن میں کافی کام کیا۔ ایک طرح سے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بنگال میں ودیارتھی سنگٹھن کی نیو ڈالنے والوں میں ایک آپ بھی تھے۔ اس سلسلے میں اسکاٹش چرچ کالج میں آپ نے 'اسٹوڈنٹ یونین' قائم کی اور اس کے پہلے صدر آپ ہی چنے گئے۔

۱۹۲۹ء میں جب سائمن کمیشن ہمارے دیش میں آیا تھا تو اس کے بائیکاٹ میں کلکتے کے ودیارتھیوں نے جو بھاری حصہ لیا تھا۔ اس کے اگوا آپ ہی تھے۔ پولیس کے دمن کے خلاف کلکتہ کے ودیارتھیوں نے جو بھاری ہڑتال کی تھی اس کے نیتا بھی شری شچیندر ہی تھے، جس کے نتیجے میں دوسرے چار سو ودیارتھیوں کے ساتھ آپ کو کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ اس پر تمام بنگال کے ودیارتھی سماج نے بھاری ناراضگی ظاہر کی تھی۔ اس طرح آپ زندگی کے ہر لمحے میں انقلاب کا بگل بجاتے رہے تھے۔

اس زمانے میں اسکاٹش کالج کے پرنسپل مسٹر کیائرن تھے، جو شری شچیندر کو ایک ذہین ودیارتھی سمجھ کر بڑی محبت کی نظر سے دیکھتے تھے انھوں نے شری شچیندر کی ماں کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے صلاح

دی کہ آپ شچیندر کو معافی مانگنے کے لئے سمجھائیے، جس سے وہ پھر کالج میں داخل ہوسکے۔ لیکن شچیندر کی ماں نے جواب دیا۔

"میرے بیٹے نے کوئی قصور تو کیا نہیں ہے، پھر میں اُس سے معافی مانگنے کو کیوں کہوں"

اور ایسی ماں کی کوکھ سے شچیندر جیسا بہادر لڑکا ہوا تو اس میں تعجب ہی کیا۔

اسکاٹش کالج سے نکالے جانے کے بعد شری شچیندر رپن کالج میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۹۲۹ء میں آپ نے عزت کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔

اس کے بعد اسی زمانے میں آپ ایس۔ این۔ مکرجی اینڈ کمپنی میں ٹریننگ کلاس میں داخل ہوگئے۔ اس کمپنی کے ٹریننگ کلاس میں داخل ہونے والے ودیارتھیوں کے سب سے پہلے دل میں آپ بھی ایک تھے۔ اسکے ساتھ ہی آپ نے آل بنگال اسٹوڈنٹس یونین کی نیو ڈالی اور اُسکی ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر رہے۔ اسکے اگلے سال یونین کے پریسیڈنٹ چُنے گئے۔ اس طرح اُس چھوٹی سی عمر میں ہی بنگال بھر کے ودیارتھیوں نے اپنا سب سے بڑا نیتا آپ کو چُنا تھا۔

۱۹۳۰ء میں جب گاندھی جی نے قانون توڑنے کی لڑائی چھیڑی تب آپ کی اسٹوڈنٹس یونین نے ایسے لٹریچر کو پڑھ کر قانون توڑنے کا فیصلہ کیا جو سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ شری جے۔ ایم سین گپتا نے اس کام کے لئے خاص طور پر ودیارتھیوں میں پرچار کیا تھا۔

اس فیصلے کے مطابق کالج اسکوائر میں شری شچیندر کی صدارت میں ایک سبھا ہوئی، جس میں بنگال کے سب سے بڑے اُپنیاس لکھنے والے سورگیہ شرت بابو کا مشہور اُپنیاس "پاتھیر داوی" جسے بنگال سرکار نے ضبط کر رکھا تھا، سرعام پڑھا گیا۔ اس جرم میں آپ گرفتار کر لئے گئے اور آپ کو قید کی سزا دی گئی۔

جب آپ جیل میں ہی تھے، تب آپ کی ماتا جی کا انتقال ہو گیا شری شچیندر کے اوپر یہ کوئی معمولی چوٹ نہ تھی، کیونکہ بچپن سے ہی شری شچیندر نے صرف ماں کا دُلار ہی پایا تھا۔ لیکن شری شچیندر اس چوٹ کو ہنستے ہنستے جھیل گئے۔ قریب چھ مہینے کے بعد زیادہ بیمار ہو جانے کی وجہ سے آپ جیل سے چھوڑ دئے گئے۔

اسکے بعد سا۱۹۳۱ء کی کراچی کانگریس میں آپ شریک ہوئے اور وہیں سے آپ نے کل ہندستان میں ودیارتھیوں کے سنگٹھن کا کام شروع کیا اور بنگال کی یوتھ لیگ کا بوجھ اپنے سر پر اُٹھا لیا۔

اس زمانے میں آپ نے بنگال کے بہت سے حصّوں کا دورہ کیا اور اس سے سنگٹھن کے کام میں بہت مدد ملی اور اسکے ساتھ ہی جنتا نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ شری شچیندر کتنا اچھا بولتے ہیں اور کتنی محنت سے اپنا کام پورا کرتے ہیں۔ 'انڈیا ٹوڈے' نام کے ایک اخبار میں سہایک سمپادک بھی آپ اسی زمانے میں رہے۔

سا۱۹۳۲ء میں جب پھر قانون توڑنے کا آندولن چلا تو آپ اور آپ کے بڑے بھائی دونوں ہی قید کر لئے گئے۔ آپ کی دسمیتی کے دفتر پر بھی سرکار نے تالا ڈال دیا اور بہت سا سامان پولیس اٹھا کر بھی

لے گئی۔ قریب ایک سال بعد آپ رہا کئے گئے اور تب آپ نے فوراً ہی 'بنگال سیوا' دل کا سنگٹھن شروع کیا۔ اسی زمانے میں آپ کی وہ ٹریننگ پوری ہو گئی، جو آپ مکرجی اینڈ کمپنی میں لے رہے تھے۔ اونچی اونچی تعلیم پانے کے لئے آپ ۱۹۲۳ء میں انگلینڈ چلے گئے۔ انگلینڈ پہنچ کر آپ نے ہندستانی ودیارتھیوں کے سنگٹھن کا کام کیا۔ اس زمانے میں آل انڈیا یوتھ لیگ نے لندن کے لئے آپ کو نمائندہ چن دیا تھا۔ انگلینڈ رہتے وقت آپ اکثر بنگلہ کے 'بھاوی کال' اور انگریزی کے 'وائس آف دی یوتھ' اخبار میں لیکھ لکھتے رہتے۔

کچھ دن بعد آپ لندن کے 'لندن اسکول آف اکنامکس' میں داخل ہو گئے، لیکن اس اسکول کی پڑھائی ختم کرنے سے پہلے ہی آپ بیمار پڑ گئے اور کئی مہینے تک سوئٹزرلینڈ کے ایک ہسپتال میں پڑے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ ہندستان لوٹے اور یہاں آ کر آپ نے بیمہ کا کام شروع کیا۔ کچھ دنوں تک آپ بیمہ کے بارے میں نکلنے والے ایک انگریزی اخبار کے سمپادک رہے، اسکے بعد آپ ایک ولائتی بیمہ کمپنی میں ایجنٹوں کے انسپکٹر کے پد پر رہے۔ اپنی اس نوکری کے ساتھ ہی آپ 'فیلڈ' نام کا انگریزی اخبار بھی نکالا کرتے تھے؛ 'امیتا بھ متر' کے نام سے اس اخبار کا سمپادن بھی آپ ہی کرتے تھے۔ کمپنی نے جب اس اخبار پر اعتراض کیا تب آپ نے اخبار بند کر دیا۔ اسکے بعد آپ نے اس کمپنی کی نوکری چھوڑ دی اور ایک دیشی بیمہ کمپنی میں پہنچ گئے۔ اس بار 'فیلڈ' اخبار کو 'فیلڈ مین' کے نام سے آپ نے نکالا اور سمپادک کی جگہ اپنا اصلی نام ہی دیا۔ ۱۹۲۸ء میں کچھ دوستوں کی مدد سے آپ نے 'سٹی آف کلکتہ' کے

نام سے ایک بیمہ کمپنی کھولی اور بیمہ ایجنٹوں کی تعلیم کے لئے ایک اسکول بھی قائم کیا۔

دھیرے دھیرے شری سچیندر بیمہ کی دنیا کے نیتا ہو گئے اور ہندوستان کی سبھی بیمہ کمپنیوں نے آپ کو اپنا نمائندہ چُنا۔ اس حیثیت سے 'بیمہ قانون' کی مخالفت میں آپ ایک بار لارڈ لنلتھگو سے ملے۔ لارڈ لنلتھگو پر آپ کی بحث کا اتنا اثر پڑا کہ بیمہ کمپنیوں کی مانگیں منظور کر لی گئیں۔

یورپ سے لوٹنے کے بعد اس زمانے تک آپ نے ہندوستان کی راج نیتی سے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا تھا اور رہن سہن بھی آپ کا بالکل ہی صاحبی ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں آپ جیسے اپنی اس خاموشی سے خود ہی گھبرا اُٹھے اور بھارت ماتا کی سیواؤں کے اتنے دنوں کے قرض کو معہ سود کے چکانے کے لئے اُن کے پران پھڑ پھڑانے لگے۔ اس بار گاندھی جی کے اصولوں کی روشنی نے اُن کو اپنی اور کھینچا اور آپ گاندھی جی کی لکھی ہوئی کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے لگے۔ ایک بار کچھ شنکاؤں کو آپ نے گاندھی جی کے پاس لکھ بھیجا۔ جواب میں گاندھی جی نے لکھا:-

"میری کتابوں کو سادودھانی سے پڑھو۔ پھر بھی کچھ شنکا رہے تو دو مہینے بعد مجھے لکھنا۔"

۱۹۴۰ء میں جب ویکتی گت یا انفرادی ستیا گرہ شروع ہوا تب پچھلی منسٹری کے زمانے میں جو نقلی لوگ کانگریس میں بھر گئے تھے، وہ بھی کانگریس سے ہٹنے لگے۔ شری سچیندر اسی زمانے میں کانگریس سے الگ رہے تھے، لیکن اس وقت وہ اُس سے کیسے الگ رہ سکتے تھے۔ اس

زمانے میں دن رات اُن کے دل میں ایک آگ سی دھکا کرتی تھی اور وہ اکثر اپنے ملنے جلنے والوں سے کہا کرتے تھے۔ "ہم نے دیش کے لئے کیا کیا ہے؟ دیش میں پھیلے ہوئے اس اندھیرے کو مٹا کر ہم اسے روشن کیوں نہیں کر پا رہے ہیں؟ دیش کے گمراہ نوجوانوں کو ہم کیوں نہیں سمجھا پا رہے ہیں؟ کانگریس کے پیچھے تمام دیش کو کھینچ لانے میں ہمیں کامیابی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ ہم میں ایسی کیا کمی ہے؟" اصل میں وہ ان سوالوں کا جواب خود اپنے دل سے چاہتے تھے۔

اسکے بعد شچیندر ناتھ ۱۹۴۲ء کے آندولن میں کود پڑے۔ اُنھوں نے اس طوفان کے وقت ودّیارتھیوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ کالجوں اور ہوسٹلوں میں گھوم گھوم کر ودّیارتھی سماج کو بھارت ماتا کی پکار سنانے لگے۔ قربانی کی دعوت لے کر انھوں نے گھر گھر کے دروازے کھٹکھٹائے۔ کلکتہ کے ودّیارتھیوں نے اس طوفان میں جو حصّہ لیا تھا، وہ سب شری شچیندر ناتھ کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا۔ آخر ۱۹ اگست کو وہ پکڑ لئے گئے اور دم دم جیل میں پہنچا دئے گئے۔

دم دم جیل میں اُن کی زندگی میں ایک گہرا پریورتن ہوا اور اُن کا من دھرم شاستروں میں زیادہ رہنے لگا۔ وہ دن رات گیتا، سپت شتی، یوگ واشِشٹ، اُپنشد، پُران، قرآن وغیرہ روحانی کتابوں میں ہی ڈوبے رہنے لگے۔ اپنی روزانہ کی زندگی کو بھی وہ اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس سے اُن کا دل ایک سورگیہ روشنی سے جگمگا اُٹھا اور جب تب سے اُنکے من میں سکتی اور خود اعتمادی کے ان گنتی جھرنے پھوٹ نکلتے، جو اُن کے

من میں نئے نئے انکر پیدا کرنے لگے۔

اسی جیل کی زندگی میں اُنھوں نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی 'کلکی' اور مسٹر ریمارک کی 'فلٹ سام' نام کی کتابوں کا بنگلہ میں ترجمہ کیا۔

یہ سب کرتے ہوئے بھی آپ اپنے جیل کے ساتھیوں کی بڑی بھاری خدمت کیا کرتے تھے۔ نوجوان ساتھیوں کو اُن کی ضرورت کی چیزیں دلانا، اُنکے پڑھنے کے لئے اچھی کتابیں منگوانا، اُن سے امتحان دلانے کا انتظام کرنا، اُنکے لئے دیا کھیان مالا کا سلسلہ چلانا وغیرہ نہ جانے کتنی ذمہ داریاں شری ستیندر نے اپنے سر لے رکھی تھیں۔ اس لئے ساتھی قیدی آپ کو دم دم یونیورسٹی کا وائس چانسلر کہا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں آپ جیل سے چھوڑے گئے لیکن ساتھ ہی یہ بندش لگا دی گئی کہ آپ کلکتہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ جیل میں ہی شری ستیندر کو یہ پکا یقین ہو گیا تھا کہ اگر دیش واسیوں میں سوراجیہ کی سچی خواہش پیدا نہیں کی گئی اور کانگریس کے کاریہ کرتاؤں کو گاندھی جی کے اصول اچھی طرح نہیں سمجھائے گئے، تو اس دیش کا اُدھار ہونا مشکل ہی ہے۔ ....

فرقہ پرستی کے اُبھار کے وقت جس طرح بہت سے کانگریسی اس دلدل میں خود جا پھنسے اور پھوٹ پھیلانے والے فرقہ وارانہ سنگٹھنوں سے ہمدردی رکھنے لگے تھے، اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دوراندیش دیش بھگت نے اصلیت کو کتنی سچائی کے ساتھ محسوس کر لیا تھا۔

اُس زمانے میں اُنکے دل میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اُن کو صرف سیاسی کاموں میں ہی نہیں لگا رہنا چاہیئے۔ وہ مختلف کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے سماج کی جو مختلف سیوائیں کیں اُنکی

وجہ سے دوسرے دوسرے علاقے کے لوگ اُنکی طرف کھنچے اور اُنکے اثر میں آنے لگے۔ اس کام کے لئے شری شچیندر کو صرف تین سال کا وقت مل سکا۔ لیکن اس چھوٹے سے زمانے میں ہی اُنھوں نے جنتا کا ہت کرنے والی کتنی ہی نئی سنستھائیں کھول دیں اور کتنے ہی نئے کام شروع کر دئے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان تین برسوں میں ہی شچیندر پوری طرح کھلے اور اُن کے دل و دماغ کی طاقت اپنے بہتر سے بہتر روپ میں اسی زمانے میں جنتا کے سامنے آئی۔

۱۹۲۴ء میں شچیندر، بنگیہ بھارت سنگھ، جو بنگال کے ودیارتھیوں کا سب سے بڑا سنگٹھن ہے، کے سبھاپتی چنے گئے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد ودیارتھیوں کو اپنا پیارا پرانا نیتا پھر مل گیا۔ اُن کا سبھاپتی بننا تھا کہ سنگھ میں نئی جان پڑ گئی۔ اپنے میٹھے سوبھاؤ کے کارن شچیندر بابو ودیارتھیوں اور نوجوانوں کے بیچ بڑی عزت اور پیار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے کبھی کبھی شچیندر بابو اپنی بھاوکتا کے اُبھار میں ایسی باتیں کہہ جاتے تھے کہ وہ سننے والوں کے دل پر امِٹ اکشروں میں لکھ جاتی تھیں۔ ایک بار اُنھوں نے اپنے ساتھیوں سے روندھے ہوئے گلے سے کہا تھا۔

"بھائیو! ماتا کا رِن چکاؤ۔ جس دیش کے پیارے دُلار میں پل کر تم انسان بنے ہو، اُسکی حالت پر تو غور کرو۔ سبھی دیشوں میں وہاں کے نوجوان ہی دیش کی بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ تم بھارت کی جوانی کو کلنک نہ لگا دینا!"

۱۹۲۴ء میں جو دمن ہوا، اُس کے اثر سے دیش بے جان ہو گیا تھا۔ جنتا اُداس اور ڈری ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں شچیندر نے جیل سے

چھوٹنے والے کئی ساتھیوں کو لے کر، کلکتہ کانگریس ورکرس یونین، بنائی۔ اس کے کچھ دن بعد گاؤں کے لئے کانگریس کاریہ کرتا تیار کرنے کی غرض سے انھوں نے 'کانگریس سیوا سنگھ' کا سنگٹھن کیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے پریشان کانگریس کاریہ کرتاؤں کو ایک روشنی ملی اور وہ پھر کام میں جُٹ گئے۔ گھور اندھکار میں بھی شری شچیندر اسی طرح روشنی کی کوئی کرن پیدا کر دیتے تھے۔

کانگریس کے پرچار کام کے سلسلے میں شچیندر نے محسوس کیا کہ ہکوساہتیہ لکھنے والے چترکار، مورتی بنانے والے، گایک، نرتک، اور ابھنیتا (ایکٹر) وغیرہ سبھی طرح کے کلا کاروں کو کانگریس کے حلقے میں لانا چاہئے۔ اُن کا کہنا تھا کہ کانگریس کی رہنمائی میں آزادی کی جو ویدی تیار ہو رہی ہے اُس سے دور کھسک کر کوئی نہیں رہ سکتا۔ آزادی کی لڑائی کی جھلک ہم کو ہندستان کی ہر ایک چیز سے ملنی چاہیئے۔ کیا مورتیاں، کیا لٹریچر، کیا ہمارے ڈرامہ، سنیما، اور کیا ہمارے شادی بیاہ ان سب سے اتنا تو ظاہر ہوتا رہنا ہی چاہیئے کہ ہندستان اس وقت آزادی کی لڑائی میں لگا ہوا ہے اور ہمارا سب سے بڑا فرض اُس میں مدد دینا ہے اُس میں حصّہ لینا ہے۔ اس طرح شچیندر کے ہردے کی ایک ایک دھڑکن آٹھوں پہر دیش کی آزادی کے سُر ہی سجاتی تھی۔ ایک دن تو انھوں نے اپنے یہ خیالات ماسٹر اناتھ گوپال سین کے سامنے رکھے۔ اُن کی صلاح سے، اور کچھ دوسرے ساہتیہ کاروں کے سہیوگ سے دسمبر ۱۹۴۲ء میں، کانگریس ساہتیہ سنگھ، قائم کرنے میں شچیندر کو سپھلتا ملی۔ اس سنگھ کی پکار پر دیش کے انیکوں لیکھک اور کوی بھارت ماتا کے آنگن میں اکٹھے ہو سکے۔ شری اُتل چندر گپت،

سجنی کانت داس، سبودھ گھوش، دیش بدیشوں میں مشہور چترکار نندلال بوس، بدیشی چترکار مور ہاؤس، تسنیتی پال، پروفیسر اندو گڑ، شنکری سین اور مشہور ناچنے والے پرہلاد داس اور دوسرے نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے کلاکار اس سنگھ کے جھنڈے کے نیچے آکر آزادی کی لڑائی میں تن من سے سہیوگ دینے لگے۔

شچیندر ناتھ کی دن رات محنت نے ان دیش سیوی کلاکاروں کے اس ملن اور سنگٹھن کو ایک بھاری طاقت بنا دیا۔ ۱۹۴۶ء کے فروری کے مہینے میں کانگریس ساہتیہ سنگھ کی کوششوں سے راشٹریہ چتروں کی پہلی نمائش ہوئی۔ کانگریس کے سالانہ جلسے پر نندلال بوس کے بنائے ہوئے سندر چتروں کو کلکتے کی جنتا شاید پہلی بار دیکھ سکی۔ ان چتروں میں یہ درشایا گیا تھا کہ بھارت کے سات لاکھ گاؤں کی نئی زندگی اور ترقی ہی سوراجیہ کا اصلی مقصد اور اس کی صحیح تصویر ہے۔ اسکے بعد تصویروں کی اور بھی نمائشیں کی گئیں۔ گاندھی جی کے اصول، ہندستان کے سبھی فرقوں کا بھائی چارہ، دیش کے شہیدوں کا اتہاس اور اس طرح کی دوسری چیزیں اور مسائل پر ان نمائشوں کی تصویروں میں بڑی خوبصورتی اور بڑے پُر اثر طریقے پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے جنوری کے مہینے میں شری شچیندر نے راشٹریہ تصویروں کی ایک بہت بڑی نمائش کی، جس میں تصویروں کے سہارے ہندستان کی آزادی کی لڑائی کا پورا اتہاس دکھایا گیا تھا۔

چترکاری کی ہی طرح ڈراموں اور فلموں گیتوں کے ذریعے دیش بھگتی کا پرچار کرنے کی طرف بھی شچیندر نے اپنا دھیان لگایا۔ اس سے بنگال میں بہت سے ڈرامیٹک کلب کھلے۔ کتنے ہی پرانے راشٹریہ گیت پھر جنتا کی

زبان پر تازہ ہو اُٹھے اور بنگال کے صبح شام اُنکی میٹھی لے سے گونجنے لگے۔ ایسے بہت سے گیتوں کی راگ راگنیاں بھی اُنھوں نے تیار کرائیں اور ان گیتوں کے سنگرہ بھی شچیندر کی کوششوں سے کتابی شکل میں نکلے جنکو جنتا نے بے حد پسند کیا۔ ان کاموں میں شچیندر کو اتنی زیادہ لگن تھی کہ وہ قریب قریب ہر ایک اتوار کو کسی نہ کسی گاؤں میں گیتوں یا چرخے کا دنگل رکھ دیتے تھے۔ یہی دنگل ایک اچھی سبھا کا کام بھی دے جاتا تھا، جس میں آئے ہوئے لوگ شری شچیندر کے دیش بھکتی میں ڈوبے ہوئے بھاشنوں کو سنکر مگدھ ہو جاتے تھے اور اکثر لوگ وہیں سبھا میں اُنکے سامنے وعدہ کرتے تھے کہ آگے سے وہ بھی دیش کے کام میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور دینگے۔ اس طرح شچیندر نے سیکڑوں نئے لیکن سچے کاریہ کرتا گاؤں سے نکالے تھے۔

اسی بیچ اور بھی کتنی ہی نئی نئی سنستھائیں شچیندر نے قائم کیں اور کتنی ہی سنستھاؤں سے اُنھوں نے اپنا سمبندھ قائم کر لیا۔ بالی گنج، راشٹریہ سیوا سنگھ، نارکول ڈانگا، گوبر ڈانگا، آتو پاڑا وغیرہ میں جتنی بھی نوجوانوں کی سماجیں تھیں، اُن سب میں اُن کی رسیٹھ پیٹھ تھی اور وہاں کے لوگ اُن کو اپنا بھلا چاہنے والا ایک سچا دیش بھکت سمجھتے تھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کاریہ کرتاؤں کی تعلیم کے لئے شری شچیندر نے ماسٹر اننت گوپال سین کی دیکھ ریکھ میں ایک اسکول بھی چلایا اور اسکا تعلق بہت سے سنگٹھنوں کے ذریعے چلائی جانے والی گاؤں کی رات پاٹھ شالاؤں سے قائم کیا۔

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو کلکتے میں جو بھیانک بلوہ شروع ہو گیا تھا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شری شچیندر کو اسکا آبھاس پہلے ہی ہو گیا تھا اسی لیئے اس بلوے سے کچھ ہی دن پہلے سے اُنھوں نے ہندو مسلم ایکتا پرچار میں ہی اپنی تمام طاقت لگانی شروع کر دی تھی۔ اسکے لیئے وہ دونوں فرقوں کی ملی جلی سبھائیں کرتے تھے اور دونوں فرقوں کے نیتاؤں کے دستخط کرا کے ایکتا کی اپیلیں نکلواتے تھے۔ لیکن بلوہ نہ رُک سکا۔ کیونکہ اسکی جڑیں بہت زیادہ گہری پڑ چکی تھیں اور پھوٹ و جوش سے بھری ہوئی اوچھی باتیں جنتا کے دماغ پر جلدی اثر کر جاتی ہیں۔ لیکن شچیندر نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔

شچیندر نے محسوس کیا کہ کلکتے میں ہونے والے اگست کے بلوے کا دوسرا دور پوربی بنگال میں چلایا جاوے گا۔ اسلیئے کچھ دوستوں کو لیکر وہ میمن سنگھ، چٹگاؤں، کومِلا، نواکھالی وغیرہ گئے۔ ۱۶ اگست سے پہلے اور اسکے بعد، نام سے اُنھوں نے ایک کتاب چھپوائی تھی، جسکے ساتھ کانگریس ساہتیہ سنگھ کی کتابیں اور ایکتا کا پرچار کرنے والی تصویروں کے ساتھ وہ ان گاؤں میں دروازے دروازے پہنچ کر ایکتا کا الکھ جگاتے پھرے۔ گھر میں آرام کرسی پر لیٹ کر نیتاؤں کو گالیاں دینے کے شوقین بھائی شائد کہیں گے "کیسا پاگل پن تھا؟ اس سے بلوہ روک لیا گیا؟" وہ نہیں جانتے کہ یہ ایک ایسی ہی دلیل ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ دھرم کی کتابیں اور رشی منی و پنڈت لوگ فضول ہی نیک چلنی کا اور سدا چار سے رہنے کا اُپدیش دیتے ہیں، اس سے دنیا کا پاپ رُک گیا کیا؟ یہ صاف ہے کہ ایسے لوگوں کی اس طرح کی دلیلوں کا جواب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

سنہ ۱۹۴۶ء کے نومبر دسمبر میں جب نواکھالی میں جان بوجھ کر آگ
بھڑکائی گئی تب شچیندر نرپورہ اور نواکھالی کی سیما پر بسے ہوئے،
ہیمچر نام کے ایک استھان میں اچھوت بھائیوں کی سیوا میں لگے
ہوئے تھے۔ اس علاقے کے چاروں طرف بھیانک بلووں کی آگ
جل رہی تھی اور کسی بھی ہندو کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں
تھا، لیکن شری شچیندر نے اپنی جگہ سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ وہ
اس زمانے میں بھی مسلمانوں کے گاؤں میں بے دھڑک چلے جاتے
تھے اور اُن کو اپنے ہندو پڑوسیوں کی حفاظت کے لئے سمجھاتے
بجھاتے تھے۔ اس علاقے کے تمام مسلمان اُن کی بڑی عزت کرتے
تھے اور اسی لئے شری شچیندر کو کسی حد تک اپنے کام میں کامیابی بھی
ملی۔ شچیندر کے کام میں سب سے بڑا روڑا اٹکانے والے وہ ہندو لیڈر
تھے، جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں نواکھالی کا بدلہ وہاں کے
مسلمانوں سے لینے کے لئے اُکساتے پھرتے تھے۔ لیکن اس علاقے
میں گھری ہوئی ہندو جنتا کی کھوج خبر لینے کے لئے وہ اُدھر کی اور
جھانکتے بھی نہیں تھے۔ ایسے لیڈروں کی تقریریں اس علاقے کے گندے
مسلمان لیڈر خوب نمک مرچ لگا کر وہاں کے مسلمانوں کو سُناتے تھے،
جس سے شچیندر جو کچھ اُنکو سمجھاتے تھے، اُسکا اثر بہت کم ہو جاتا تھا۔
اس کے بعد شچیندر پھر نئے سرے سے اُنکو سمجھاتے تھے اور پھوٹ
پرست مسلمان لیڈر پھر اُن کی دلیلوں کے خلاف وہاں کی مسلمان
جنتا کو بھڑکاتے تھے، بس اسی طرح یہ کشمکش کافی دن تک چلتی رہی
جسکے بیچ میں رہنا شچیندر جیسے ساہسی آدمی ہی کا کام تھا۔ لیکن

شچیندر نے موت سے ڈرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

اسی زمانے میں شچیندر کی جان پہچان باپو سے ہوئی اور باپو نے اُن کو ہمّت دیتے ہوئے کہا تھا۔ "تم کو کام کرتے رہنا ہوگا۔ ہار مان لینے سے کیسے بنے گا!"

۱۹۴۷ء کے مارچ میں شچیندر کلکتے لوٹے تو اس دیش بھگت کا دل آپس کی خونریزی سے داغ داغ تھا۔ جو باتیں کبھی خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھیں، وہ اُن کو آنکھوں سے دیکھنی پڑی تھیں۔ کوئی ہلکے دماغ کا آدمی ہوتا تو اس حالت میں ہندو فرقہ پرستی کے رنگ میں رنگ جاتا۔ اس سے جنتا سے عزت بھی ملتی، پیسے بھی ملتے اور ہزاروں آدمی اُن کو کندھوں پہ اُٹھائے پھرتے۔ لیکن جس آدمی نے ہندو دھرم کے شاستروں کا اتنی گہرائی سے منن کیا ہو اور اُنکے ہی مطابق اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کی ہو، وہ ایسی غلطی کیسے کر سکتا تھا؟ وہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا ہے، اُس میں دوش نہ ہندو کا ہے، نہ مسلمان کا ہے بلکہ فرقہ پرستی کا ہے۔ بس وہ فرقہ پرستی کے خلاف ایسے نوجوانوں کا سنگٹھن کرنے میں جُٹ گئے، جو کٹھن سے کٹھن سمے میں بھی اپنی جگہ پہ اڈگ رہ سکیں۔ اُس وقت ایسا سنگٹھن کر لینا معمولی بات نہیں تھی، کیونکہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ ایکتا کا نام سنتے ہی جنتا گالیاں دینے لگتی تھی اور جو لوگ مارکاٹ اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا "اپنی حفاظت" کے نام پر پرچار کرتے پھرتے تھے، سماج کی نیتا گیری اُن لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن شچیندر ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ سبھاؤں میں اور

آپسی بات چیت میں وہ اپنے اصول کا نڈر ہو کر پرچار کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے بنگال ٹیچرس کانفرنس میں لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ لوگ آگے آئیے۔ اُن لوگوں کی مدد کیجئے جو دیش کو سچ مچ اونچا اٹھانا چاہتے ہیں اور نوجوان اور بالکوں کے دماغ میں فرقہ پرستی کا جو زہر بھر دیا گیا ہے، اُسے دھونے اور صاف کرنے میں جُٹ جائیے!"

شچیندر کی یہ اپیل بیکار نہیں گئی اور ڈاکٹر امییہ چکرورتی و شری متی سُچیتا رائے جیسے وِدوان لوگوں نے اُنکو سہایتا دینا منظور کیا اور اُن کو پوری طرح مدد دی۔

شچیندر نے جو خون خرابی دیکھی تھی، وہ دن رات اُن کو بےچین کئے رہتی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ نفرت اور دشمنی و چھُرے بازی ہم کو کائر اور بے شرم بنائے دے رہی ہے۔ بدلہ لینے کے نام پر ہم جانور بنتے جا رہے ہیں اور اس سے پورے دیش کا وناش ہوتا چلا جائے گا۔ اپنی ان بھاؤناؤں کا پرچار کرنے کے لئے شری شچیندر نے بنگالی ناٹک لکھنے والوں سے پرارتھنا کی کہ وہ اس مسئلے پر ایک پُراثر ناٹک لکھ دیں لیکن یہ لوگ ٹال مٹول کرتے رہے۔ آخر شچیندر نے خود ہی ایک ناٹک لکھ ڈالا۔ اُنھوں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ اگر کچھ دیر انتظار کیا جا سکتا تو اُن کلاکاروں کا لکھا ہوا ناٹک کہیں زیادہ پُراثر اور جاندار ہوتا۔ لیکن ضرورت تو آج ہے۔ انتظار کا وقت اب ہمارے پاس کہاں ہے؟ جو کام کوئی نہ کرے، وہ کام کرنے کے لئے میں تیار ہوں"۔ اس طرح شچیندر کو پل بھر کو بھی چین نہیں تھا۔ جب اُنکے ساتھی اُنکے تیز قدموں کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے، تب بھی وہ آگے بڑھتے ہی جاتے

تھے۔ انسانیت کی پکار پر وہ کسی کا بھی انتظار کرنے کے لیے کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔

جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ نزدیک آنے لگی تو شچیندر سوچنے لگے کہ ہماری آزادی کا روپ کیا ہوگا؟ آزادی کی دیوی ہماری جنتا سے کیا مانگے گی؟ وہ اپنی ان بھاؤناؤں کو جنتا میں پھیلانے کے لیے پوسٹر تیار کرانے لگے۔ اسی طرح کے انھوں نے گیت بھی لکھوائے ایک گیت کی کچھ کڑیاں ہیں۔

"چھوٹی لو بندھن، ٹوٹی لو شرنکھل
نوتن پربھاتے کی تو را جادی بل!
رکھشن ہو پران چاہئے سجے بلیدان
راکھی سے تا رمان، سواگت ویر دل"

یعنی "اس نئے پربھات میں کون چلتے ہو؟ بولو۔ ماں کی عزت کو بچانے کے لیے انگنت قربانیوں کی ضرورت ہے۔ ویرو! تمھارا سواگت ہے!"

جون ۱۹۴۷ء میں شچیندر نے 'سنگٹھن' نام سے ایک اخبار نکالا جس میں اپنا پہلا سمپادکیہ لیکھ لکھتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا۔ "آج ایک نئے قسم کی پکار ہوئی ہے۔ یگ یگ کی سادھنا سے خوش ہو کر راشٹر دیوتا آشیرواد دے رہا ہے۔ اس آشیرواد کو لینے کی ہمت کس میں ہے؟ اس آشیرواد کو لینے اور اس کا پالن کرنے کی ہمت دیش میں کون کرے گا؟ سنگٹھن کرنے والوں کے نام سے آج تک جو اپنا پرتیچے دیتے رہے ہیں، آج انکے امتحان کا وقت ہے۔ آج انکی کسّما،

دھیرج اور اپنے اصولوں کے لئے وفاداری کا امتحان ہونے والا ہے۔

اُنھوں نے اس طرح کا ایک سنگٹھن بنایا۔ ۱۹/ ۲۰/ جولائی کو کاریہ کرتاؤں کی ایک سبھا ہوئی اور ایک سنگٹھن بنانے کی اسکیم بنی۔ اُسکے کنوینر شچیندر بنائے گئے۔

۱۳/ اگست ۱۹۴۷ء کو کلکتے کے دیش بندھو پارک میں ہونے والی ایک سبھا میں لیکچر دیکر اپنے دوستوں کے ساتھ شچیندر لوٹ رہے تھے یکایک اُنھوں نے کہا "دیکھو، اہنسا پر میرا پورا یقین ہے۔ لیکچر بھی دیتا ہوں۔ لیکن جب تک اس پر عمل کرتے ہوئے جنتا نہیں دیکھے گی تب تک صرف لیکچروں پر وہ یقین نہیں کرے گی۔ ہمیں اور اونچا اُٹھنا ہوگا، اور کبھی ایک امتحان دینا ہوگا!"

اتوار کو اُنھوں نے یہ کامنا کی اور سوموار کو وہ پوری بھی ہو گئی۔ ایک ستمبر ۱۹۴۷ء کو کلکتے میں اکسمات بلوہ ہو گیا۔ 'چھاتر سانسد' کے کسی ممبر نے 'فیلڈ مین' کے آفس میں اسکی اطلاع شچیندر ناتھ کو دی۔ سنتے ہی شچیندر اپنے تین ساتھیوں کو لے کر باہر نکل پڑے۔ راستے میں کچھ مسلمان بھی ان کے مشن سے ہمدردی رکھتے تھے، اُنکے ساتھ ہو لئے۔ ایک یہ دل نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ ناخدا مسجد کے پاس بلوہ ہونے کی خبر سُنکر شچیندر اُدھر ہی چلے۔ کیننگ اسٹریٹ اور چیت پور روڈ پر مسلمانوں کے ایک دل نے اُنکو آگے بڑھنے سے زبردستی روکنا چاہا اور شچیندر و اُنکے دو ساتھیوں کو چھرے سے گھایل کر دیا۔ شچیندر کے ساتھی مسلمانوں نے شچیندر کی حفاظت کے لئے حد درجہ کی کوشش کی، لیکن وہ بیکار رہی گئی۔ شچیندر ناتھ کے پیٹ میں چھرے کا گھاؤ تھا۔ آخر اُنکے ساتھی

مسلمان کسی طرح کھینچ کھانچ کر انکو گنڈوں کی بھیڑ سے باہر نکال سکے اور بڑی ہمت کے ساتھ انکو ایک لاری میں میڈیکل کالج ہسپتال میں لے جا سکے۔ شچیندر کو جس طرح وہ یہاں تک لائے یہ صرف اُنکی ہمت تھی۔

ہسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیوں میں شچیندر نے آخری دن کے لئے آنے والے دوستوں سے کہا تھا "آج مجھے بہت خوشی ہے۔ اتنی خوشی مجھے کبھی نہیں ہوئی"

"جس بڑے کام میں ہم گھائل ہوئے ہیں، اُسکو داغ نہ لگنے دینا۔ دوستو! بنگال کے نوجوان اور ودیارتھیوں سے میری یہ پرارتھنا کہہ دینا کہ شچیندر تمھارے ہاتھوں میں ماں کی عزت بچانے کا کام چھوڑ کر گیا ہے"

۲ ستمبر بدھ وار کو صبح کے وقت اس بہادر دیش بھکت اور ماں کے اس انوکھے لال نے آخری ہچکی لی۔ باپو اُس وقت انشن کئے ہوئے تھے۔ پھر بھی انھوں نے شچیندر کی موت کی خبر پاتے ہی اُن کی پتنی کو ہندوستانی میں ایک خط لکھا، جس میں باپو نے لکھا تھا۔

"شچیندر متر مر کر امر ہو گئے ہیں۔ ایسی موت پر دکھ منانے کے بجائے آنند منانا چاہیے۔ آپ اُنکے قدموں پر چل کر اُنکے پرتی رہنے والے اپنے پیار کو ظاہر کر سکتی ہیں"

کچھ دنوں بعد باپو بھی اُسی راستے چل دئے جس راستے اُن کا یہ پیارا شِشیہ گیا تھا۔

آج بھی کلکتے کے ایسے بہت سے "سوُرویروں" کو جانتا ہوں جنھوں نے بلووں کے دنوں میں دوسرے فرقے کے کسی راستہ چلتے ہوئے بے بس

مسافر یا گھرے ہوئے پڑوسی پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ ایسے لوگ بڑی بے شرمی سے اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر آج بھی اپنی اس بہادری کا بکھان کرتے ہیں۔ لیکن جنکے آنکھیں ہیں اور دماغ ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اصلی بہادری اُن بے بسوں کی ہتیا میں تھی یا شچیندر کی طرح لوگوں کو بچانے کے لئے جان بوجھ کر آگ میں کود پڑنے میں تھی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو شچیندر کو ایکتا کے کام میں لگا دیکھ کر اُنھیں 'غدار' کہتے تھے اور اُنھیں ہندو دھرم کا دشمن بتاتے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ شچیندر نے اپنے پران دیکر بھی ہندو دھرم کو بچا لیا۔ بدلہ لینے کے نام پر بے قصور لوگوں کی ہتیا کرنے والے کایر جب اپنے کو 'ہندو' کہتے ہیں تو مجھے اپنے 'ہندو' ہونے پر شرم آنے لگتی ہے، لیکن جب تک شچیندر جیسے نوجوان ہندو جاتی میں ہیں تب تک ہندو دھرم پر میری شردھا اچل ہے، اڈگ ہے۔

کبھی کبھی رات کے سناٹوں میں مجھے شچیندر کا وہ آخری سندیش سنائی دیتا ہے، جو اس نے زندگی کی آخری گھڑیوں میں کلکتے کے ودیارتھیوں اور نوجوانوں کو مخاطب کرکے تمام دیش کو یا ہر ایک دیش بھکت کو دیا تھا اور میں سوچتا ہوں کہ شچیندر کی آتما آج بھی ہمارے جواب کے انتظار میں ہے۔

[یہ لیکھ شری شچیندر ناتھ مترکے ایک نزدیکی دوست شری نرنجن سین گپت کے ایک لیکھ کے سہارے لکھا گیا ہے، جسکا ہندی ترجمہ شری بھگوان جی متر نے کرنے کی کرپا کی تھی۔ سمپادک]

شری شیجیندر متر

(لیکھک۔ شری اُتل چندر گپت)

شچیندر کا نام بہت دنوں سے سُنا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی اُنکی دیش سیوا کا تھوڑا بہت حال بھی جانتا تھا۔ کانگریس ساہتیہ سنگھ کے سلسلے میں اُن سے جان پہچان بھی ہوئی۔ وہ اس سنگھٹن کے قائم کرنے والے اور سکریٹری تھے۔ وہ ایسے شخص تھے جو تھکان کا نام بھی نہیں لیتے۔ اُن سے آمنے سامنے کی پہچان ہونے پر میں تعجب سے بھر گیا۔ میرا خیال تھا کہ شروع سے ملک کے لئے کام کرنے والے اور خاص کر نوجوان ودیارتھیوں کے میل میل میں رہنے والے اس آدمی میں کم سے کم نام پانے کی خواہش تو ہوگی ہی۔ پر یہ چیز تو اُن میں ڈھونڈے بھی نہ ملی۔ دیش کے اوپر قربان ہونے والے اس آدمی کی زندگی دیش کی عام پبلک کی زندگی سے جدا قسم کی ہوگی، میرا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ اُن کے لئے ایسا کرنا ناممکن تھا۔ زندگی کی یہ سادگی ہی اُنکی اصلی خوبی تھی۔ تبھی تو وہ ہر روز بنا شان و شوکت کے، ملک کا کام کرتے رہتے

تھے۔ لوگ اُنکی سادگی پر اس قدر فدا تھے کہ انجان آدمی بھی اُنکے حکم کو ٹالنا پسند نہ کرتے تھے۔ اُنکی خوش مزاجی، نرمی اور مٹھاس سے اُنکے جاننے والے بیحد خوش تھے۔ اُنکی کامیابی کی بھی شاید یہی وجہ تھی۔ دیش کے کام کو وہ اپنا کام ہی سمجھتے تھے۔

باپو جی کے وچاروں نے اُن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لئے گاندھی واد کو ہی وہ سب سے اچھا طریقہ مانتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے آزاد بھارت کی جو تصویر کھینچی تھی وہ اُن کو پورے طور پر پسند تھی۔ گاندھی جی کے اصولوں کے سانچے میں اُنکی عادتیں بندھ گئی تھیں۔ اسکے ساتھ ہی وہ رویندر ناتھ کے وچاروں کے بھی قائل تھے۔ اُنکی دیش سیوا صرف سیاسی ہی نہیں تھی بلکہ چترکلا، ساہتیہ اور سنگیت کی ترقی بھی اُنکے ذریعے ہوئی۔ طرح طرح کے کاموں میں نبھا لینے کی کیسی خوبی اُن میں تھی، یہ بتانا مشکل ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت کی ایک نرالی تصویر ملک کے آگے پیش کرنے کے خیال سے ہی 'سنگٹھن پتریکا' کا نکالنا شروع کیا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ضرورت کے موقعہ پر یہ بہادر سپاہی ہم سے بچھڑ گیا۔ مرنے کا جو نمونہ انھوں نے پیش کیا ہے، معلوم نہیں اُس سے دیش کا بھلا ہوگا یا نہیں۔ اتہاس کا چڑھاؤ اُتار جان سکنا مشکل ہے۔ لیکن شچیندر ناتھ مترا کا 'بلیدان' اُن کی قابلیت اور قیمت میں اس سے کچھ فرق نہیں آسکتا۔ اُن کی زندگی اپنی روشنی سے روشن اور اپنے کاموں سے جگمگ تھی۔

فرقہ پرستی کو وہ بہت ناپسند کرتے تھے اور اُسے مٹانے کے لئے ہی وہ مر مٹے۔ اُن کی زندگی میں جو سادگی تھی وہ اُن کی موت میں بھی قائم رہی۔ کسی کی کچھ شکایت نہیں۔ صرف اُن کے گزرنے پر ایک ہی بات بار بار کھٹکتی ہے کہ ایسا دوسرا آدمی تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

شری سمر تیش بنرجی

(لیکھک ایک ساتھی)

آزادی ملنے کے بعد جب کلکتے میں ہمارے دیش کی آزادی کے دشمنوں نے فرقہ پرستی کی آڑ لیکر، انسانیت اور آزادی کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور قریب قریب کامیاب سے ہو چکے تھے، تب جن تھوڑے سے دیش بھگتوں نے اپنی جان دیکر بھی اس سازش کو بے کار کر دیا تھا، اُن میں سے ایک تھے شری سمر تیش بنرجی، جو اسی طرح کے ایک دوسرے شہید شری شچیندر متر کے پیارے ساتھی تھے۔ شری سمر تیش بنرجی چھوٹی سی عمر سے ہی دیش بھگتوں کے دل میں شریک ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں جب وہ آٹھویں یا نویں درجے میں پڑھتے تھے، بنگال کے کرانتکاری دل کے ایک اچھے کاریہ کرتا تھے۔ بعد میں سنہ ۱۹۳۰ء میں ایف۔ اے پاس کرتے ہی وہ گاندھی جی کے 'نمک قانون توڑو' آندولن میں شریک ہو گئے اور اُتر پاڑا (کلکتہ) کانگریس کمیٹی کے ایک سویم سیوک کی حیثیت سے اس آندولن میں کام کرتے ہوئے انھوں نے ایک برس کی قید کاٹی تھی۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں جیل سے چھوٹنے پر وہ 'گن نایک' نام کے اخبار کے اڈیٹر ہوگئے ساتھ ہی گاندھی جی کے ہریجن آندولن میں بھی انھوں نے اچھی دلچسپی لی۔ ہگلی میں کسان آندولن کی نیو بھی آپ نے ہی ڈالی تھی سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ ڈاکٹر بھوپیندر ناتھ دت کے ساتھ 'میمن سنگھ جن ساہتیہ سنگھ' میں شامل ہوئے اور وہاں سے لوٹتے ہی پھر گرفتار کرلئے گئے۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں جیل سے چھوٹتے ہی پھر انھوں نے اپنا کام شروع کردیا۔ بنگال صوبہ کے ودیارتھیوں کی سب سے بڑی سبھا 'بنگیہ چھاتر پریشد' کے آپ ایک خاص کاریہ کرتا تھے اور اسی زمانے میں آپ نے کسان مزدوروں کا سنگٹھن بھی کافی مضبوط بنالیا تھا۔ آپ آل انڈیا کسان سبھا کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور بنگال صوبے کی کمیونسٹ پارٹی کے حلقوں میں بھی آپ کا کافی اثر تھا۔

'ترپوری کانگریس' سے لوٹ کر شری ستیش نے جنتا کا ایک نئے سرے سے سنگٹھن کرنا شروع کیا۔ اس پر سنہ ۱۹۴۲ء میں آپ پھر گرفتار کرلئے گئے۔ سنہ ۱۹۴۳ء تک آپ ہجلی جیل میں بند رہے۔ وہاں سے چھوٹنے پر آپ نے کمیونسٹ پارٹی سے استعفیٰ دیدیا اور صرف کانگریس کے جھنڈے کے نیچے ہی کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی زمانے میں آپ بنگال صوبہ کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں آپ نے آزادی کی لڑائی کا ایک اتہاس تصویروں میں تیار کرایا۔ کانگریس کی اجازت پر یہ تصویریں بمبئی اور مدراس میں دکھائی گئیں اور وہاں بے حد پسند کی گئیں۔ ان تصویروں میں سراج الدولہ اور انگریزوں کی لڑائی سے لیکر سنہ ۱۹۴۲ء تک کی تحریکوں کو دکھایا گیا تھا اور یہ

تصویریں بنگال کے نامی چترکاروں نے تیار کی تھیں۔

۱ستمبر ۱۹۴۷ء کو شری سچیندر متر اور شری سمرتیش نے ان تصویروں کی ایک نمائش کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن یکایک بلوہ بھڑک اٹھنے کی وجہ سے آپ نے یہ پروگرام ملتوی کر دیا اور آپ شری سچیندر کے ساتھ شانتی قائم کرنے میں لگ گئے۔ ۱ستمبر کو ہی شری سچیندر ایک شانتی جلوس کو نکالتے ہوئے چھرے سے شکار ہوئے، لیکن شانتی جلوسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۳ستمبر بدھوار کو اسی طرح کے ایک جلوس کو نکالتے ہوئے شری سمرتیش بنرجی بھی چھرے کے شکار بنے اور کچھ ہی دیر میں ایک ہسپتال میں آپ بھی سورگ سدھار گئے۔

لیکن شانتی اور انسانیت کے دشمنوں نے آپ کو مار کر جیسے خود اپنی چھاتی میں چھرا بھونک لیا تھا۔ بلوے کے اس دہشت بھرے زمانے میں آپ کی ارتھی کے ساتھ ہندو مسلمانوں کی ایک بڑی بھیڑ، جس میں دونوں کے بڑے بڑے نیتا بھی تھے، شمشان تک گئی اور وہاں اس نے آپ کی چتا کی راکھ ہاتھ میں لیکر یہ قسم کھائی کہ اب کلکتے میں فرقہ پرستی کے راکشس کو زندہ نہیں رہنے دینگے۔ اسکے بعد ہی کلکتے میں شانتی ہونا شروع ہوئی۔ اسطرح شری سمرتیش نے ہزاروں بے گناہوں کی جان بچانے کے لئے اپنے انمول پرانوں کو خوشی خوشی شانتی کی ویدی پر چڑھا دیا۔

شری سمرتیش امر ہیں، وہ کبھی مر نہیں سکتے۔

شری سمرتیش بنرجی

[ہزایکسیلینسی شری کیلاش ناتھ کاٹجو، گورنر پچھمی بنگال کا وہ بھاشن جو انھوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۴۸ کو بالی (کلکتہ) میں شہید سمرتیش کی مورتی پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے دیا تھا۔]

آج ہم شانتی اور امن کے اُس سپاہی کی یاد تازہ کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں، جس نے اس کلکتہ جیسے بڑے شہر میں بسنے والی الگ الگ جماعتوں میں پریم، شانتی اور آپس میں رواداری بنائے رکھنے کی لگن میں اپنی جان تک قربان کر دی۔ اُن لوگوں کو، جو اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے، سمرتیش بنرجی، بنا کسی سوارتھ یا انعام اکرام کی خواہش کے، انسانیت کا پاٹھ پڑھانے گیا تھا۔ پچھلے بیس برس سے بلکہ بچپن سے ہی اُس نے شانتی قائم کرنے کے لئے اپنے آپ کو دیش کی سیوا میں ارپن کر رکھا تھا۔ اسکے لئے وہ میدان میں اُترا۔ اُس نے انتھک کوشش کی۔ اُسکی موت بالکل میرے دوست گنیش شنکر ودیارتھی جیسی تھی، جو ۱۹۳۱ء میں کانپور کے فرقہ وارانہ فساد میں شہید ہوئے تھے۔ وہ ایک شاندار موت تھی۔ بنگال

کے اتہاس میں سمر تیش بنرجی کا نام امر رہے گا اور جیسا کہ گاندھی جی نے اپنے سندیشے میں کہا تھا " اس طرح کی شاندار موت کے لئے کسی کو رنج نہیں کرنا چاہیئے " دیش کو ضرورت ہے اور گاندھی جی نے کہا تھا۔ " مجھے ضرورت ہے کہ سمر تیش بنرجی جیسے کام کرنے والے آگے بڑھیں " آج ہم اُس مہان پُرش کی یادگار اپنے سوارتھ کے لئے کھڑی کر رہے ہیں " تاکہ ہم اُسے بھول نہ جائیں اور یہ یادگار ہمارے سامنے رہ کر ہمیں اس چیز کی یاد دلاتی ہے جسکے لئے وہ اپنی جان پر کھیل گیا۔ ہمیں اُس کام کی اچھائی اور نیکی کو سمجھ کر اُسے آگے بڑھانا چاہیئے۔ ایک طرف سے تو یہ یادگار ہمارا سر نہیں اُٹھنے دیگی۔ اگر کوئی ودیشی کلکتہ آئے اور سمر تیش بنرجی کی یادگار کو دیکھ کر پوچھ بیٹھے کہ یہ چیز کون سے کارنامے کو بتانے کے لئے ہے، تو مجھے یقین ہے کہ میں اور آپ اُس سے گھبرا کر اُداس دکھنے لگیں گے اور یہ بتاتے ہوئے ہمارا سر شرم سے جھک جائیگا۔ کہ جب کلکتہ کے نواسی مذہبی نفرت کے کارن دیوانے ہوگئے تھے، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، بلکہ ایک دوسرے کی جان تک لے رہے تھے، اُس سمے یہ شرافت کا پتلا اُس بھائی بھائی کے فساد کی لہر سے ٹکر لینے کو کلکتے کی گلیوں میں نکلا تھا۔ یہ مذہبی جھگڑے ہماری شان میں چار چاند نہیں لگاتے۔ بلکہ انسانی سماج کی نظروں میں ہمیں اور بھی گرا دیتے ہیں۔ یہی باتیں ہمارے لئے ڈوب مرنے کی ہیں۔ ہمارے مہاتماؤں اور پیغمبروں کی شکشا، تہذیبی کلچر، ہمارے بڑے بڑے مذہب، ہماری سماجی زندگی اور ہماری سنسکرتی کو یہ بٹہ لگاتی ہے اور ہمیں کوڑی کے لائق نہیں چھوڑتی۔ کلکتے کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں

یہاں مذہبی پاگل پن کے شعلے بھڑک گئے، نفرت پھوٹ پڑی تھی۔ اُس کا اثر دور دور تک پھیلا اور اُسنے سارے ملک میں بے انت دُکھ، مصیبت اور تباہی کا روپ دھارن کیا۔ ایک سال بعد ہمارے سب سے بڑے نیتا مہاتما گاندھی کے ذریعے بھگوان نے ہمیں اُس آگ پر قابو پانے میں مدد دی اور کلکتے نے وہ شاندار مثال قائم کی جس پہ ہر ہندستانی اور ہر ودیشی اُس مذہبی بھائی چارے کو دیکھ رشک کھاتا تھا۔ کچھ ہی دن بعد پھر انسانی دماغ پہ بھوت سوار ہوا۔ تب سمریش بنرجی جیسے منش آگے بڑھے اور سر دھڑ کی بازی لگا، جان کو داؤں پر رکھ، کلکتے کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کو لگنے سے روکنے میں کام آئے۔ گاندھی جی نے پھر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال شکھ اور شانتی کا بول بالا کیا۔ پچھلے بارہ ماس کے اور اپنے پورے تجربے کی بنا پر میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ آج کلکتے کے الگ الگ فرقوں میں پڑوسیوں جیسا میل ملاپ اور پیار ہے۔ پانچ مہینے ہوئے جب یہاں آنے پر میں کلکتے کے ہر حصے کے آدمیوں سے ملا تو تمام شہریوں میں بھائی چارہ اور پریم کی گاڑھی چھٹی دیکھ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ لیکن یہ جادو، جسے گاندھی جی اور سمریش بنرجی جیسے جادوگروں نے پھونکا تھا، ایک بار پھر بیکار گیا۔ محرم کے آخری دن کے جھگڑے کی خبر نے بیماری کے بستر پر بھی مجھے پریشانی اور فکر میں ڈال دیا۔ پرماتما کا شکر ہے کہ دونوں طرف کے لوگوں نے جلدی ہی ہوش سنبھال لینے پر اور قانون اور شانتی قائم کرنے کے لیے گورنمنٹ اور اسکے افسروں نے سمجھداری کے جو قدم جلد ہی اٹھائے اُنکی بدولت فساد کا گلا شروع سے ہی گھونٹ دیا گیا۔ لیکن

بڑے شہر میں امن جلدی ہی قائم ہو گیا۔ لیکن یہ سب کچھ تب تک نہ ہو سکا جب تک کہ کچھ گھر نہ اُجڑ سکے تھے اور کچھ بچے یتیم نہ بن گئے اور یہ اُس سمے تک ہوتا رہے گا جب تک کہ گورنمنٹ کا فرض نہ ہو جائے کہ وہ امن اور انصاف کو بنائے رکھے۔ ضرورت پڑنے پر سرکار طاقت ہی کے بل پر یہ کر سکتی ہے۔ لوگوں کی ہنسا، لڑائی جھگڑے، فساد اور اینٹ پتھروں کا جواب پولیس کو ڈنڈوں، آنسو گیس اور چارو ناچار گولیوں ہی سے دینا پڑتا ہے۔ سرکار کو اپنا فرض تو نبھانا ہی ہو گا لیکن پھر بھی امن قائم رکھنے کی ذمہ داری کا بوجھ لوگوں ہی کے کندھے پر ہے۔ سرکار تو کیول ٹھیک طرح کے حفاظتی انتظام کر کے چوری چکاری، ڈاکہ زنی یا لوگوں کے مال و جان کی رکشا، پولیس کے طریقوں سے جرموں کی روک تھام کر سکتی ہے۔ پر ان مذہبی جھگڑوں کے لئے لوگوں کی اپنی انسانیت کی آواز کو اوپر اُٹھانا ہو گا۔ ہم اُس راج کی استھاپنا کر رہے ہیں، جہاں مذہبوں کی تمیز، رنگ روپ اور نسل میں فرق کچھ معنی نہیں رکھتے۔ قانون کی نظر میں ہر شہری کا جان و مال بنا کسی بھید بھاؤ کے پیارا سمجھا جائے گا۔ ہر شہری کو اپنا جیون بتانے اور اپنے ایشور اللہ کی پوجا بندگی کرنے کی آزادی اور برابر کے ادھیکار ہوں گے، یہی ہمارے جیسے آزاد اور روادار دیش میں ہونا چاہئے۔ ہمارے مہاتماؤں اور شاستر کاروں کا بھی یہی کہنا ہے۔ ایک سچے ہندو کے لئے یہ سب سے بڑھ کر فخر کی بات ہے کہ اُس کا مذہب دوسرے سب مذہبوں کی عزت کرتا ہے اور اُن کا آدر کرنا سکھاتا ہے۔ ایک ہندو کے لئے پوجا بندگی کا ہر طریقہ اُسے بھگوان کے نزدیک لے جاتا ہے۔ سوچ وچار

اور پوجا بندگی کی آزادی ہی تو ہمارے جیون کی روح ہے۔ کسی بھی انسانی سماج یا مذہب کے نزدیک کسی آدمی کو خدا کے نام پر اپاہج کر دینے یا مار ڈالنے سے بڑھ کر اور کوئی پاپ نہیں ہے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ کلکتہ شہر کے امن اور شانتی کے شیدائی اس معاملے میں اپنے فرض کو پہچانیں گے۔ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہر کے باسی ہیں۔ جو کچھ یہاں ہوگا اُسی کا رنگ کہیں اور جا کر کھلے گا اور ان دنوں جبکہ وہ ہوا، جس میں ہم سانس لیتے ہیں، ان اشنکوں در بے اعتباریوں کے کارن زہریلی ہو چکی ہے۔ یہ بدلے لینے کے سپنے مہنگے پڑینگے۔ اسلئے ہماری بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ میرے اتنا کہہ دینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کہ سرکار تھوڑی یا بہت گنتی والی جاتوں کے بنیادی شہری حقوق میں فرق کرتی ہے یا نہیں۔ آج قانون کو قانون کی عزت کرنے والے ہر شہری کی حفاظت کرنی ہوگی۔ کسی بھی مذہب کا کوئی بھی آدمی بنا کسی دباؤ یا دبدبے کے اپنے وچاروں کو سب کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ قانون کو بھنگ کرنے والا کسی بھی مذہب کا کیوں نہ ہو، بھلے ہی اونچے درجے کا ہو، اُسے مناسب سزا ملے گی ہی۔ ایک آدمی کے بُرے کاموں کی سزا ساری جماعت کیوں بھگتے اور نہ کوئی کبھی یہ وہم یا گمان کرلے کہ کچھ آدمیوں کی کالی کرتوتوں کا کا بدلہ بہتوں سے لیا جائیگا۔ بلکہ جیسا میں کہہ چکا ہوں، سرکار تو ہنسا کا سر کچلنے کو ہمیشہ تیار ہے لیکن اس بات کی ذمہ داری کا بوجھ تمام برادری پر ہے۔ ہندو، مسلم، عیسائی یا پارسی کلکتہ میں ایک بڑے گھرانے کی طرح آباد ہیں اور انھیں ایک خاندان کے آدمیوں کیطرح

رہنا چاہیے۔ کسی ایک ہندو یا مسلمان کے کئی سو میل کی دوری پر بیٹھ کر کسی غلطی کے کر دینے کا نزلہ کہیں اور دور معصوم اور امن پسند لوگوں پر گرے بھلا یہ کہاں کا انصاف ہوا؟ یہ تو جہالت، ناسمجھی اور جانور پنا ہے۔ یہ سچ بھی ہے۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں اور اس بھول کی قیمت ہمیں، دُکھ، مصیبت، خون اور آنسوؤں سے چکانی پڑتی ہے۔ آؤ! آج ہم اس بات کو ہمیشہ کے لئے گرہ میں باندھ لیں۔ اتنے بڑے ہندستان کی آبادی الگ الگ دھرموں سے بنی ہے اور ساری جنتا ایک ہو کر ایک بڑے راج کے لئے ملکر سیوا کرنے میں جٹی ہوئی ہے اور جب تک کسی شہری میں، دیش کی سچی سیوا کرنے کی لگن ہے! اُس کے ساتھ بھائی چارے کا برتاؤ ہونا ہی چاہیئے۔ باقی سرکار پر چھوڑیئے۔ یہ اُس کا فرض ہے کہ اگر کہیں کوئی ظلم ہو جاتا ہے یا کہیں ہمارے راج سے باہر کوئی گھٹنا ہو جاتی ہے تو وہاں کی حالت ٹھیک ٹھاک کرنے کے لئے مناسب جتن کرے۔ لیکن اپنے راج کے اندر ہمیں ایک دوسرے سے دوست، ساتھی اور ایک بڑے ملک کا بھائی بند سمجھ کر پیش آنا چاہیئے۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ لیکن کئی دفعہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھلا دینے سے ہی بہت بھاری نقصان پلے پڑ جاتا ہے۔ یہ غلطیاں ہمیں ہر قیمت پر تیاگ ہی دینی ہوں گی۔ میں آشا کرتا ہوں اور ایشور اللہ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ سر تیش بنرجی کی یادگار اس بڑے شہر میں ہمیشہ امر رہے اور ہم میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے سچے راستے پر لا کھڑا

کرے۔ کلکتے کے کوچے کوچے اور گھر گھر میں شانتی اور پریم کا ہمیشہ راج رہے۔

انوواد ک۔ شری جتیندر کوشک

شری ویریشور گھوش اور سوشل گپتا

[سمپادک]

شری ششچین منزا اور شری سمر تیش بنرجی کے ساتھ ہی شری سوشل گپتا اور شری ویریشور گھوش ۲ بھی ایکتا اور بھائی چارے کا پرچار کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ ہمیں اس بات کا بید ڈکھ ہے کہ کافی کوشش کرنے کے بعد بھی ہم ان دو شہیدوں کی زندگی کے حالات نہیں پا سکے۔ ہاں، اتنا ضرور معلوم ہو سکا ہے کہ دونوں ہی ونّیارتھیو ہیں دیش بھگتی کا پرچار کرتے تھے۔ ان دونوں کی موت پر بنگال کے بڑے سے بڑے نیتاؤں نے افسوس ظاہر کیا تھا اور ان

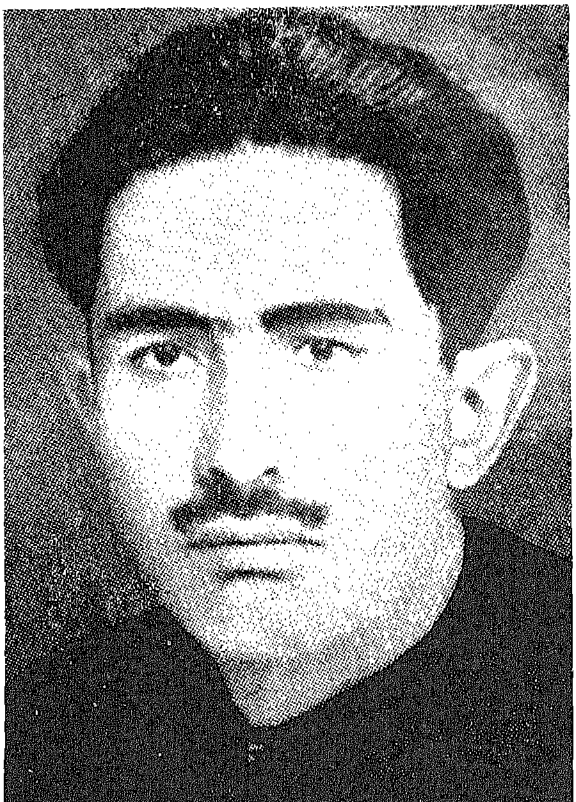
---

۲ ہمیں امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ہم ان دونوں شہیدوں کی زندگی کے پورے حالات دے سکیں گے۔ سمپادک

کی شہادت نے کلکتے کی خون خرابی کو روکنے میں کافی مدد کی تھی. اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے حلقوں میں کافی اثر رکھتے تھے.

ان دونوں شہیدوں کے چرنوں میں ہم ادب سے اپنا سر جھکاتے ہیں۔

آج کے شہید



میر مقبول شیروانی

شہید شیروانی

["شہید شیروانی" لیکھ کے لیکھک بھائی ویدویرلیشورجی اُن بہادر کشمیری نوجوانوں میں سے ہیں، جو قبائلیوں کے حملے کے وقت، بجائے اسکے کہ اور لوگوں کی طرح بھاگ آتے، کشمیر میں ہی حملے ہو رہے تھے اور نراشا کی اُن گھڑیوں میں بڑے دھیرج کے ساتھ ایک ذمّہ داری کی جگہ پر کام کرتے رہے تھے۔ اسکے بعد جب کشمیر کی حالت کافی سُدھر گئی تب آپ انبالہ آگئے اور آج کل انبالہ کے ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج میں پروفیسر ہیں۔

شہید شیروانی سے ویدلیشورجی کا نجی پریچے تھا، اسی لئے اس لیکھ میں ایک ایسا درد ہے، جو پڑھنے والوں کے دل کو چھوئے بنا نہیں رہ سکتا۔

ویدلیشورجی ہر ایک مسئلے پر خود اپنے طور پر سوچ وچار کرتے ہیں اور کبھی کسی سنگٹھن یا جماعت کی بات آنکھیں موند کر نہیں مان لیتے۔ اسی لئے کچھ لوگ اُن پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کے دل میں ہندو فرقہ پرستی کا زہر بھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف ایسے لوگ، جنکے ارادے اور کرتوتیں اب جگ ظاہر ہو چکی ہیں، اُن پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ مسلمانوں

کے ساتھ بکش بات کرتے ہیں۔ ایسے ہی وقت میں شاید کسی شاعر نے اپنا وہ مشہور شعر کہا ہوگا۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر سمجھا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

لیکن یہ ریفیوجی کو نہ ان کی پرواہ ہے اور نہ اُن کی۔ وہ دونوں کے الزاموں پر مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کو دُکھ بھی ہوتا ہے کیونکہ آخر وہ بھی آدمی ہی ہیں۔ لیکن اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ اس نٹھر دنیا کا صرف اُن کے ہی ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہے۔

وہ ریفیوجی جیسی دنیا چاہتے ہیں، ویسی ہی دُنیا بن جائے، یہی ہم سب کی کامنا ہے۔

[سمپادک]

شہید شیروانی

(بھائی دید دیہ لیشور جی پروفیسر ڈی اے۔ وی کالج انبالہ)

۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی منحوس صبح کو پاکستان کی شہ پر قبائلی حملہ آوروں نے سری نگر (کشمیر) کے اتر پچھم کی اور سے حملہ کیا۔ دن چڑھنے سے پہلے پہلے سارا شہر مسان بن گیا۔ ہر طرف سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں مکان، گودام، دکان اور گوردوارے و مندر مسجد سب دھو دھو کر کے جل رہے تھے۔ کشن گنگا کا میٹھا نیلا پانی بے گناہوں کے خون سے لال ہو چلا تھا۔ سارا دریا لاشوں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ منوں سونا چاندی کو ہالہ کے راستے راولپنڈی پہنچایا گیا اور دن بھر لوٹ مار کے عصمت دری کا بازار گرم رہا۔ اسکے دوسرے دن حملہ آور آندھی کی طرح بڑھتے بڑھتے تیس چالیس میل اور آگے بڑھ آئے اور دوپہری تک مظفر آباد سے اڑی تک کے سارے گاؤں خاک کر دیئے گئے۔ جو لوگ جو جان بچا کر بھاگ سکنے میں سپھل ہو گئے تھے، ہانپتے کانپتے گرتے

بڑھتے بارا مولا چلے آئے۔ اُڑی کے نزدیک ہونے کے کارن یہ خبر سب سے پہلے بارا مولا میں پہنچی۔ وہاں لوگوں میں بھئے اور آتنک چھا گیا۔ لیکن اُنھیں اپنے چھوٹے شیر میر مقبول شیروانی پر پورا بھروسہ تھا۔ شیروانی نے اپنے فرض کو پہچانا اور جنتا کو تسلی دے کر اور اُسے اپنا فرض سمجھا کر خود مورچے پر گیا جہاں ریاستی فوج کی ایک ٹکڑی بریگیڈیر راجندر سنگھ کی کمان میں نالہ پُل پہ حملہ آوروں کو روکنے کی آخری کوشش کر رہی تھی۔ وہاں سے کچھ میل واپس آکر شیروانی رام پور میں ٹھہرا۔ وہاں لوگوں کو اپنا فرض ادا کرنے کے لئے اُبھارا۔ حملہ آوروں سے اپنے دیش کو بچانے کے لئے انھوں نے ایکتا کو سب سے ضروری بتایا۔ جب شیروانی اس طرح رامپور میں لوگوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ سری نگر میں اس ہولناک حادثے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔ وہاں کے لوگوں کے حوصلے اور بھی پست ہوگئے۔ جب بارا مولا روڈ کا ٹریفک بند ہوگیا۔ تو لوگ بڑی بڑی قیمتیں دیکر تانگوں اور بیل گاڑیوں میں چلے آنے لگے۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے اور مقبول شیروانی خود اس بات کو محسوس کر رہا تھا، اسلئے کچھ دیر ریاستی فوج کے ساتھ دشمن کو روکنے کا کام اپنے کچھ ساتھیوں کو سونپ کر وہ خود اپنے شہر بارا مولا کی فضا کو سنبھالنے کے لئے چلا آیا۔ ۲۴ر کی صبح کو وہاں پہنچتے ہی اُس نے لوگوں کے دلوں میں ایک نئی اُمید اور اُن کے سینوں میں ایک نیا جوش اور بازوؤں میں ایک نئی طاقت بھر دی۔ دیش کے نام پر اُس نے ساری جنتا سے پرارتھنا کی کہ اپنے پیارے دیش کی مریادا کے مطابق ہی ہندو مسلمان اور سکھ بھائی ایک ہو کر اپنے سندر

دیش کو بچائیں ۔ اس طرح بھیتری حفاظت کا بھار نیشنل کانفرنس کمیٹی پر چھوڑ کر وہ اصلی حالت کو سمجھنے کے لئے سری نگر چلا آیا ۔ سری نگر میں حملے کی خبر سنتے ہی نیشنل کانفرنس نے حفاظتی دستے تیار کرنے شروع کر دیئے تھے اور اُسکا دفتر لال چوک کے پاس والے کارونیشن ہوٹل میں کھول دیا گیا تھا ۔ اُسی شام کو ماسے سوما چوک میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے ساری گھٹنا کو جنتا کے سامنے رکھا اور دس ہزار ایسے نوجوانوں سے لئے اپیل کی جو اس آڑے وقت میں دیش کے بچاؤ کے لئے کام کر سکیں ۔ مقبول شیروانی نے بھی شاید اس اپیل کو سنا اور جلسے کے بعد ہی وہ اپنے قائد اعظم شیر کشمیر شیخ عبداللہ سے کارونیشن ہوٹل میں ملا ۔ شیروانی کی دلیری کو شیخ نے کافی سراہا ۔ لوگ کہتے ہیں کہ کچھ دیر بعد جب وہ اُن سے بات چیت کر کے باہر آیا تو اُسکے منہ سے گمبھیرتا دھیرج اور ایک مستقل ارادے کے نتیجے کے بھاؤ جھلک رہے تھے ۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ اس نے ایک بھاری مہم کو سر کرنے کا آخری فیصلہ کر لیا ہے ۔

حملہ آوروں کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں کی خبریں برابر آ رہی تھیں ۔ بارہ مولا میں بیوپار کے کام سے رُکے ہوئے لوگ بھی دھڑا دھڑ لوٹ رہے تھے ۔ اسی سمے مہورا پاور ہاؤس فیل ہو گیا ۔ سارے شہر میں روشنی کی جگہ اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دینے لگا ۔ اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ قبائلی مہورا پاور ہاؤس جو بارہ مولا سے کچھ ہی دور ہے ، تک آ پہنچے ہیں ۔ شہر میں اس سے اور بھی مایوسی بڑھ چلی ۔ سری نگر میں حکومت کی ساری بندش ڈھیلی ہونے لگی ۔ لیکن

نیشنل کانفرنس نے راج دھانی اور اس سے آگے اور اڑوس پڑوس کے
علاقوں کو بچانے کا انتظام شروع کیا۔ اس حالت میں شیروانی کی ذمہ داریاں
اور بھی بڑھ گئیں اور خاص کر جب حملہ آور اسکے گھر کے دروازے
تک آگئے تھے اور اسکے ساتھی اسکی راہ دیکھ رہے تھے۔ بارہ مولا
کی جنتا کو شیروانی پر پورا یقین تھا۔ اسے اسکی نیک دلی اور ہمدردی
پر پورا بھروسہ تھا اور اسی بل پہ اس نے ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا
مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح کے پیر وہاں نہیں جمنے دیئے تھے
تاریخ ۲۶ اکتوبر کی صبح کو ہی موٹر سائیکل لے کر شیروانی بارا مولا کی
اور چلا آیا۔ بارا مولا روڈ اس دن خطرے سے خالی نہیں تھی۔ اسکے
دستے قبائلی اس ساری سڑک پر چھا گئے تھے جو سری نگر سے بارا مولا
جاتی ہے اور پھر دن کو کسی بھی سمے قبائلیوں کے بڑھ آنے کا پورا
امکان تھا۔ لیکن شیروانی روکنے پر بھی نہ رک سکا۔ بارا مولا اسے
بلا رہا تھا۔ جس بارا مولا میں وہ ایک لوگوں میں سچی بیداری پھیلاتا
رہا، نیشنل کانفرنس کے اصولوں کے مطابق بھائی چارے کا پاٹھ
پڑھاتا رہا، اسی اپنی ماتربھومی کو وہ آج اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔
وہ بارا مولا پہنچا۔ وہاں اسکے والنٹیئر پہلے ہی حفاظتی دستے کا کام
کر رہے تھے اور اس بات کے لئے کافی ہوشیار تھے کہ کہیں وہاں
پر فرقہ وارانہ بلوہ نہ کھڑا ہو جائے۔ شیروانی نے آتے ہی انکو
ہند یونین اور کشمیر کے بیچ چلنے والی بات چیت کی خبر سنائی
اور انھیں شیر کشمیر کا یہ سندیش سنا دیا کہ "کشمیری مسلمانوں کو
ہندوستان اور پاکستان کے ہندو مسلمانوں کے لئے ایک

مثال قائم کرنی ہو. قبائلی ہمارے ہندو اور سکھ بھائیوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں. مسلمانوں کو اپنی جان پر کھیل کر اپنے ہندو سکھ پڑوسیوں کی حفاظت کرنی پڑے گی، کیونکہ ہر ہندو اور سکھ کی جان میرے لئے امانت ہے۔"

وقت کم تھا اور کام زیادہ . قبائلی حملہ آوروں کے بڑھتے آنے کی خبر برابر آ رہی تھی. یہاں تک کہ آس پاس کے گاؤں سے گولیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں لیکن شیروانی اپنا کام برابر کرتا گیا شیر کشمیر کا سندیش ہر ایک مسلمان تک پہنچاتا رہا. لوگ جب اپنے گھروں میں اپنی جان اور مال کو بچانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے تو شیروانی اپنے گھر کو یوں ہی چھوڑ کر موٹر سائیکل پر آس پاس کے گاؤں اور قصبوں، جیسے سوپور اور پٹن میں جا کر لوگوں کے حوصلے بلند کرتا رہا. وہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے بھائی بھائی کی طرح رہنے کی اپیل کرتا اور اس طرح سے اپنے دیش اور اپنی عزت کو بچانے کی تدبیریں بتاتا تھا. وہ جنتا کو حملہ آوروں کو روکے رکھنے کی ہمت دلاتا تھا تاکہ وہ اسی رفتار سے سری نگر نہ پہنچ سکیں جس رفتار سے وہاں تک آ پہنچے تھے. اس طرح جگہ جگہ ان کے لئے رکاوٹیں پیدا کر کے وہ چاہتا تھا کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے دشمن کو کچھ دن لگ جائیں. جس سے شاید ہندستان سے کمک آ جائے اور دیش کا بچا ہوا حصہ بربادی اور تباہی سے بچ

جائے۔ اُسے اپنے گھر کی چنتا نہیں تھی۔ سارا کشمیر اُسکا اپنا گھر تھا اور
ساری ہندو مسلمان جنتا اُسکی بھائی بہن تھی۔ سو پور سے لوٹ کر
وہ پٹن جا ہی رہا تھا کہ اُسے بارہ مولا کے گرنے کا سماچار ملا۔
آس پاس کے دیہاتوں اور قبائلیوں کے حملوں کی خبر وہ برابر
شری نگر میں نیشنل کانفرنس کے دفتر پہنچاتا رہا۔ ایک بار خود
بھی اُسے وہاں جانا پڑا۔ تب اُسکے دوستوں نے اُسے روک
لینا چاہا تھا لیکن وہ رُک نہ سکا۔ اُس وقت سبھی ہند سینا کے
آنے کے انتظار میں تھے کیونکہ ہند سے ناطے ہو چکا تھا۔ نیشنل
ملیشیا کے افسروں کا خیال تھا کہ شیروانی کو فوج کے آنے پر ملیشیا
کے ساتھ بارہ مولا بھیجا جائے، لیکن یہ خیال شیروانی کو پسند نہ آسکا
ادھر شری نگر کے بازاروں میں حفاظتی دستے اور قومی فوج (ملیشیا)
حملہ آور ــــ خبردار، ہم کشمیری ــــ ہیں تیار ــ کے نعروں سے آسمان
گونجا رہی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں جوش بھر رہی تھی ــــ اُنھیں
ایک ہو کر دیش پر مرمٹنے کے لئے اُبھار رہی تھی، اور اُدھر شیروانی
بیچ حملہ آوروں سے لڑنے چل دیا۔

اس بار بارہ مولا جاتے وقت اُسے راستے کے لئے کہیں بھیس
بنانا پڑا۔ وہ بھی ایک قبائلی سا بنا اور اُن سے مل کر وہ اُنھیں کئی
ہی ٹکڑیوں میں بانٹتا گیا، تاکہ کہیں وہ کافی تعداد میں اکٹھے ہو کر
کسی ایک طرف نہ چڑھ آئیں۔ وہ اُنھیں برابر بھٹکاتا رہا جس سے
اُنکو ٹھیک راستہ نہ مل سکے۔ اور دوسرے دن ۲۷ اکتوبر کو جب
ہند سینا ہوائی جہازوں میں شری نگر آئی تو قبائلیوں کے ہوش اُڑ گئے

وہ شری نگر کے دروازوں تک پہنچ گئے تھے اور اب انھیں اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ رامپور اور بارا مولا میں وہ کیوں رکے رہے۔ اب شیروانی کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ وہ ہند سینا کو بھی اطلاع دیتا اور قبائلی حملہ آوروں کا پتہ بھی رکھتا۔ وہ قبائلیوں کو ٹھیک اُسی راستے پر لگا دیتا تھا جس سے کہ وہ ہند سینا کا ٹھیک ٹھیک نشانہ بن سکیں۔ پٹن سے کچھ دور شری نگر کی طرف سنگھ پور میں اُس کی اس چال سے قبائلی کافی تعداد میں کام آئے۔ اُن کا دوسرا بڑا کیمپ پٹن میں تھا۔ شیروانی پہلے اُسے تڑوانا چاہتا تھا تاکہ قبائلی ڈر کر پیچھے ہٹ جائیں اور اسکے بعد انھیں پیچھے ڈھکیل دیا جائے۔ اس میں بھی وہ کامیاب رہا اور پٹن میں اُنکی ایک خاصی ٹکڑی اڑا دی گئی۔ یہاں سے کچھ قبائلی سنبل گاؤں کی اور چلے آئے۔ آتے ہی اُنھوں نے سارے گاؤں میں ہاہاکار مچا دیا۔ شیروانی فوراً ہی وہاں بھی پہنچا اور وہاں کے تمام حالات ہند سینا کے پاس بھیج دیئے جس سے وہاں بھی قبائلیوں کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ قبائلی سرداروں اور فوجی افسروں کو اپنی اس اچانک ہار پہ ہار دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ انھیں اب اس نئے پٹھان (شیروانی) پر شک ہونے لگا اور اُنھوں نے پہچان بین کرنی شروع کر دی۔ کچھ خاص آدمی صرف اسی کے لئے تعینات کئے گئے بات یہ تھی کہ قبائلیوں کو مظفرآباد سے بارا مولا تک کہیں بھی ایسی منہ کی نہیں کھانی پڑی تھی۔ اور نہ اُن کے آدمی ہی اتنی تعداد میں کہیں مارے گئے تھے۔ لیکن یہاں دو تین دنوں میں ہی کافی آدمی کام آئے۔

اس سے اُن کا شک اور بھی بڑھ گیا۔ ایک دن شُنبل سے بارا مولا آتے آتے ایک مسلم لیگی نے اسکا بھید قبائلیوں کو دے دیا اور دوسری صبح شیروانی قبائلیوں کی قید میں تھا۔

بارا مولا میں جو حالت اُسنے اپنے بھائی بہنوں کی دیکھی اُسے دیکھکر اُس کا دل رو اُٹھا تھا۔ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو سمان طور پر لوٹا گیا تھا۔ اُنکے مکانوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ عورتوں کی بے عزتی کی گئی تھی۔ یہ سب دیکھ کر اُس کا خون کھول اُٹھا تھا۔ جب اُسے اسلام کے نام پر "جہاد" کی باتیں سنائی گئیں تو اُس نے نڈر ہوکر اُنکی باتوں کا جواب دیا اور صاف صاف کہا۔ "اسلام کے نام پر ننھے مُنّے بچوں کا قتل کرنا، جہاد نہیں کہلاتا۔ عورتوں کی بے عزتی کرنا، اُن پر حملہ کرنا، لوٹ مار کرنا، یہ سب اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ ہندو اور مسلمان سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، محبّت اور سچائی اسلام کے دو بڑے اصول ہیں۔۔۔۔۔۔"

لیکن بربر قبائلیوں کے منہ سے بھیڑیوں کی طرح انسانی خون لگ چکا تھا۔ مفت مال کی چاٹ اُنھیں پڑ چکی تھی۔ شیروانی کی اِس صاف گوئی سے وہ اور بھی بگڑے۔ وہ اُس پر ٹوٹ پڑے۔ اُسے 'غدّار' ثابت کیا گیا اور طے ہوا کہ دوسرے دن جمعہ کی نماز کے بعد ہی اُسے سُولی پر چڑھا دیا جائے۔

۳۱ اکتوبر۔ جمعہ (شکروار) کو سارے قصبہ میں ڈھنڈھی پٹوا دی گئی تاکہ سبھی لوگ اکٹھے ہوں اور 'نافرمانی' کی سزا کو دیکھیں۔ سولی پہلے ہی تیار تھی جو چوک میں ایک مکان کے سہارے بنائی گئی تھی۔

سب سے پہلے اُسے صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ ہاتھوں میں کیلیں ٹھونکیں گئیں اور اُس سے ہندسینا کا حال پوچھا گیا۔ تب اُسکی پیشانی پر "یہ غدّار ہے" کی تختی کیل سے ٹھونکی تھی۔ شیروانی بڑے دھیرج سے کھڑا کھڑا یہ تمام ظلم سہتا رہا۔ اُسکی زبان سے "اُف" تک نہ نکلی۔ لوگ اُسکی ہمّت کو دیکھ کر جوش میں آتے تھے لیکن چاروں طرف قبائلی بھیڑیوں سے گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے بے بس تھے۔ وہ خون کے آنسو رونے لگے لیکن آنسو پیتے گئے۔ شیروانی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جیسے کہ وہ اپنا فرض نبھانے پر خوش خوش مر رہا ہو۔ اسلام کے ٹھیکے داروں نے اُسے جمعہ کی نماز تک پڑھنے نہیں دی، جو اُس کی آخری خواہش تھی۔ اس پر وہ چیخ اُٹھا ——

"ہندو مسلم سکھ اتحاد — زندہ باد"
"نیا کشمیر — زندہ باد"
"شیرِ کشمیر — زندہ باد"

ان نعروں پر قبائلی سردار اور بھی بگڑے۔ اب اُس پر گولیاں داغی گئیں۔ اور اُسکے بدن کو چھلنی بنا دیا۔ لوگوں میں دہشت قائم رکھنے کے لئے لاش وہیں رہنے دی تاکہ پھر کوئی ایسی حرکت کرنے کی ہمّت نہ کرے۔

کشمیر کے اس حملے میں مقتول شیروانی کا بلیدان ایک انوکھا بلیدان ہے جس میں رواداری، پریم، ہمدردی، دیش بھگتی اور انسانیت جیسی چیزیں ایک ساتھ ملتی ہیں۔

مقبول شیروانی اپنے ماں باپ کا اکیلا سہارا تھا، اپنے گھر کا اکیلا دیپک تھا۔ اپنے جیون اور جوانی کو سکھ اور ولاس میں نہ ڈال کر اُسنے اپنے دیش کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اُسکی آواز مرتے دم تک یہی رہی ــ "ایک ہوکر دشمن سے لڑو، اپنے دیش کو بچاؤ" کہ جب اُسے بارا مولا بچتا دکھائی نہ دیا تو اُسکی ساری کوشش سرینگر کے بچاؤ کی اور لگی۔ اسی لئے وہ آج کشمیر کے ہر ایک گھر کا دیپک ہے، ہر دیش بھگت کا سہارا اور آدرش ہے۔ نیشنل کانفرنس پہلے ہی باپو کے آدرش پر چلی آرہی ہے اور کشمیر کو اس بات کا گورو ہے کہ وہ باپو کی شکشا کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے، جہاں جنتا پورے بھائی چارے سے نباہ کرتی ہے، دھرم کو راج نیتی کے ساتھ نہیں ملاتی اور ساہپر دایکتا کے سانپ کا منہ وہاں ہمیشہ کیلئے کچل دیا گیا ہے۔ شیروانی اسی نیشنل کانفرنس کا ایک جوشیلا کارکن تھا اور اسی تعلیم نے اُسے یہ حوصلہ دیا۔ اُسنے باپو کی تعلیم کو سچائی کے ساتھ سمجھا تھا اور اُسی پر اپنا جیون نچھاور کر دیا۔ خود باپو نے اس شیروانی کی شہادت پر اپنی شردھا نجلی چڑھائی تھی اور شیر کشمیر نے اپنے اس بہادر سپاہی کی موت پر کہا تھا "ہزاروں برس تک ہماری آنے والی نسلیں ابھیمان سے محمد مقبول شیروانی کی قائم کی ہوئی اس مثال کو یاد رکھیں گی۔ قبائلیوں کے پنجے میں آکر وہ اپنا جیون بلیدان کرنے سے نہ کترایا تاکہ اسکی موت سے ہمارا سندر دیش بچ سکے۔ خدا اُسکی آتما کو شانتی دے......"

اور سچ مچ شیروانی جیسے شہید پر کشمیر جتنا بھی گھمنڈ کرے کم ہے۔ کشمیر کی آزادی کی لڑائی میں اُس کا نام سونے کے اکشروں سے لکھا گیا ہے۔

آج ہندستان میں جب میں فرقہ پرستوں کی جہالت سے بھری باتیں سنتا ہوں اور ایسے لوگوں کو، جنکی تمام زندگی انگریز سرکار کے پیر چاٹتے بیتی ہے، کشمیر کی نیشنل کانفرنس پر، شیخ عبداللہ پر اور اپنے دیش کے نیتاؤں پر مسلم پرستی کا شک ظاہر کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ایک ٹیس سی ہونے لگتی ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری اس پیاری اور شاندار ہندو قوم کو ہو کیا گیا ہے، جو اُن پر بھی شک کر رہی ہے جو اُن کے لئے جان دے رہے ہیں۔ میں کشمیر میں ایسے بہت سے ہندوؤں کو جانتا ہوں جو پاکستان سے ساز باز کرنے میں شریک تھے، یا جو اس مصیبت کے وقت یا تو چور بازاری کرکے دولت بھرنے میں لگے ہوئے تھے یا اپنا مال متاع سمیٹ کر، جو اُنھوں نے ہم غریب کشمیریوں کو چوس چوس کر اکٹھا کیا تھا، بھاگ آنے کو تیار تھے! لیکن کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ شیخ عبداللہ نے ٹھیک وقت پر ہمارے اور اپنے پیارے کشمیر کو بچالیا

دل تو چاہتا ہے کہ اس وقت اُن غداروں کے نام پر بھی روشنی ڈالوں، جو پہلے تو ہمیشہ کشمیر میں ہندو مسلمان کا سوال کھڑا کرکے عام

جنتا کو کچلنے میں حکومت کی مدد کرتے رہے اور جب ملک پر مشکلیں آئیں
تب بھی جتنے بھی بڑے سے بڑے کام اُن سے ہو سکتے تھے، اُنھوں
نے کئے۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل کانپ اُٹھتا ہے کہ اگر پچھلے زمانہ میں
پنڈت جواہر لال نہرو شیخ عبداللہ کی حمایت میں کشمیر نہ پہنچتے تو آج
ہماری کیا حالت ہوتی۔ لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم ٹھیک
وقت پر بچا لئے گئے۔

ایک کشمیری کی حیثیت سے مجھے مقبول شیروانی پر ناز ہے اور مجھے اس
بات پر بھی گرو ہے کہ جب کشمیر کے پڑوس میں بھائی بھائی کے گلے پر
تلوار چلا رہا تھا، تب کشمیر کے مٹھی بھر ہندو اپنے مسلمان پڑوسیوں کے
بیچ نہایت عزت کے ساتھ بنا کسی خطرے کے رہ رہے تھے۔ اسکی وجہ
یہ قطعی نہیں تھی کہ وہاں ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ اگر ہندو
حکومت ایسی حفاظت کر سکی ہوتی تو نیشنل کانفرنس کے سنگٹھن سے پہلے
کشمیر میں کیوں بلوے کھڑے ہوتے، جس میں ہندوؤں کو کافی نقصان اُٹھانا
پڑا تھا۔ بلکہ اسکی اصلی وجہ کشمیر کے شیخ محمد عبداللہ اور مقبول احمد شیروانی
جیسے بہادر اُنکے سپاہیوں کا عام جنتا پر اثر ہوا، جس نے پچھلے نو دس
برسوں سے کشمیر میں کبھی بھی فرقہ پرستی کو پنپنے ہی نہیں دیا۔ ایک بار
مسٹر جناح خود بھی اسکے لئے وہاں پہنچے تھے لیکن شیخ صاحب کے
سامنے وہ ٹک نہیں پائے تھے۔ اسی طرح ہندو فرقہ پرستوں نے بھی
وہاں ہندو مسلمان سوال کھڑا کرنے کی کافی کوشش کی۔ لیکن اُن کو
بھی ناکامیاب ہونا پڑا۔

آج بھی میرے کشمیر میں فرقہ پرستی اور انسانیت کے بیچ ایک

بھاری جنگ چل رہی ہے. کشمیر کے بیٹے اور بیٹیاں بڑی دلیری سے اس میں حصہ لے رہے ہیں اور ہندستان کی فوجوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملاکر پاکستانی فوجوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے وہاں اس بات کا کافی پرچار ہوا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں پر بھاری ظلم ہو رہے ہیں، اس لئے کشمیر کے مسلمانوں کو ہندستان کی حمایت چھوڑ دینی چاہیئے. ہندستان میں کبھی جو بلوے ہو جاتے ہیں، اُس سے پاکستان کو بھاری مدد ملتی ہے. لیکن کشمیر کے سپوت اپنے اصولوں اور اپنے ارادوں پر اڈگ ہیں، کیونکہ انکو بارا مولا کے شہید شیروانی کی وہ آخری پکار یاد ہے. کشمیر کبھی فرقہ پرستی کے آگے نہیں جھکے گا، نہیں جھکے گا، نہیں جھکے گا،

کشمیر زندہ باد

نیشنل کانفرنس زندہ باد

مقبول شیروانی زندہ باد

جے ہند

آج کے شہید



جناب شعیب اللہ خاں

محمد شعیب اللہ خاں

[حیدرآباد کے امر شہید شعیب اللہ خاں پر یہ لیکھ بہن گیان کماری ہیلڈا نے لکھا ہے، جنھوں نے خود حیدرآباد میں پرجا راج قائم کرانے کی لڑائی میں بڑی بہادری سے حصہ لیا ہے۔ اس لیکھ سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہمارے دیش کے جو لوگ یا جو سنگٹھن حیدرآباد کے مسئلے کو ہندو مسلم کا مسئلہ بنا دینا چاہتے تھے، وہ جنتا کو کتنا بڑا دھوکا دے رہے تھے۔ کیونکہ ایک طرف تو حیدرآباد میں ہزاروں ہندو ایسے تھے، جو نظام اور رضوی کے ساتھ تھے اور دوسری طرف شعیب اللہ خاں جیسے مسلمان بھی تھے، جو بڑی بہادری سے نظام اور رضوی کی مخالفت کرتے تھے۔ اور آخر اسی کے لئے شہید ہو گئے۔

ایک بات یہ اور غور کرنے کی ہے کہ حیدرآباد میں ایک آدمی بھی کسی ایسے سنگٹھن کا نہیں مارا گیا اور نہ جیل گیا جو اکثر وقت بے وقت ہندو مسلمان کا سوال اٹھاتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہی رضاکار سنگٹھن کا مقابلہ کرنا پڑا، جو ہندو مسلمان سبھی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔

شعیب اللہ خاں کی شہادت سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ کبھی کبھی رضوی جیسے لوگ جنتا کو اتنا گمراہ کر دیتے ہیں کہ اُسے 'دلّی پر آصف جاہی جھنڈا پھہرانے کی' پاگل پن سے بھری ہوئی بات تو اچھی لگتی ہے اور شعیب اللہ خاں جیسے اپنا بھلا چاہنے والوں کی باتیں کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ ٹھیک یہی حالت آج سے کچھ سال پہلے ہماری تھی، جب ہمیں باپو کی باتیں کڑوی معلوم ہوتی تھیں اور جو لوگ جوشیلی باتیں کہتے تھے، اُن کی باتیں اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ آج حیدرآباد کے وہ لوگ، جو اُس وقت رضوی کے ساتھ تھے، اس بات پر پچھتاتے ہیں کہ اُس وقت شعیب اللہ خاں کے کہنے پر کیوں نہیں چلے؟ ٹھیک یہی حالت ہماری بھی ہے۔ کاش! حیدرآباد کے لوگ شعیب اللہ خاں کی اور ہم باپو کی شہادت سے پہلے ہی اتنا سمجھ سکتے!

کاش! اب ہم آگے ہی ایسی غلطیوں سے بچ سکیں۔

سمپادک]

محمد شعیب اللہ خاں

(بہن گیان کماری ہیلڈا - حیدرآباد)

اُس دن پیارے باپو بیجواڑہ جا رہے تھے، راستے کے ایک اسٹیشن مان کوٹا (محبوب آباد) پر مولوی حبیب اللہ خاں کا انتظام تھا۔ گاندھی جی کی پتلی دُبلی دیہہ اور سچائی کے نور سے چمکتے ہوئے اُن کے چہرے نے مولوی حبیب اللہ خاں پر ایک عجیب ہی اثر ڈالا۔ گاندھی جی کا پیارا روپ اُن کی آنکھوں میں سما گیا۔ گاؤں لوٹے تو خبر ملی کہ وہ ایک بیٹے کے باپ ہو گئے ہیں۔ مولوی حبیب اللہ خاں نے اپنے بیٹے کو دیکھا، تو ویسی ہی تیج بھری آنکھیں اور چوڑا ماتھا دیکھتے ہی بولے "ارے یہ تو بالکل گاندھی ہے!" اور تب سے وہ لڑکے 'گاندھی شعیب اللہ خاں' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

x x x

گاندھی جی کے گولی لگی۔ باپو ہمیشہ کے لئے چل بسے۔ شعیب اللہ خاں اپنی سیڑھیوں پر سر پکڑ کر بیٹھے تھے، آنکھوں سے آنسو ٹپک

پڑے۔ اس طرح سے کبھی غمگین نہ ہونے والے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ماں نے کہا "بیٹا! مہاتما گاندھی تو اتنی اچھی موت پاکر مرے ہیں، پھر تو رونا کیوں ہے؟"

بیٹے نے اپنی آنسو بھری آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا "امّی! میں بھی ایسی ہی موت پاؤں تو تم آنکھوں میں آنسو نہ لاؤگی نہ؟"
ماں سہم اٹھیں۔

ودھاتا نے اس کی قسمت میں یہی تو لکھ دیا تھا۔ باپو کا یہ سچّا بھکت ٹھیک انکی ہی طرح چل دیا۔ باپو نے بھی اپنی قوم (اگر باپو کی کوئی قوم تھی تو) کے فرقہ پرستوں کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ وہ ہندو دھرم کے شاندار سنہرے نام پر بےبس اور بےکس انسانوں کے خون کے چھینٹے نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور شعیب اللہ نے بھی سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی رضاکاروں کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ اسلام کے نام پر رضاکار جو کچھ کر رہے تھے، اُسے شعیب اللہ خاں جیسا سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے جب حیدرآباد کے سیکڑوں ہندو نظام کی اور رضاکاروں کی تعریف کے گیت گاکر اپنا مطلب پورا کر رہے تھے، تب شعیب اللہ خاں نے پوری طاقت سے رضاکاروں کی مخالفت کی اور اسکا نتیجہ انکو وہی بھگتنا پڑا، جو باپو کو بھگتنا پڑا تھا۔ تبھی تو انکے بوڑھے ماں باپ بلکھ بلکھ کر کہتے ہیں "بیٹے، تم تو اُنتیس برس کی بھری جوانی میں ہی اُناسی برس کے مہاتما کے پیچھے اسی طرح چل بسے۔"

× ×

لگ بھگ پندرہ دن پہلے ایک دن دوپہر میں بات چیت کے
بیچ میں اُنکی عمر پوچھ بیٹھی۔ وہ تپاک سے ہنستے ہنستے بولے۔ "اکتوبر
مہینے میں پیدا ہونے والے بڑے بھاگیہ شالی ہوتے ہیں بہن! گاندھی
جی دو اکتوبر کو پیدا ہوئے تھے اور میں اٹھارہ اکتوبر کو پیدا ہوا ہوں"
اُن کی اس بات پہ ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کیونکہ ہم دونوں
۱۱ر اور ۱۴ر اکتوبر کو پیدا ہوئے ہیں۔

ایک دن ہیلڈا جی نے ہمیشہ کی مانند مذاق اور کسی حد تک
گمبھیرتا کے ساتھ بھی اُن سے کہا: "دیکھو میاں! تم قلم بہت چلاتے
ہو اور تمہارے پیپر پہ جلدی جلدی سنسرشپ کا آرڈر بھی آتا ہے
حکومت یا مجلس گا کانگریسی ہندو سے پہلے کانگریسی مسلمان کو ختم کرنا سوچے
گی۔ ہمارے پاس ترمذی صاحب تھے۔ اب تم اُس حلقے کے نیتا ہو، جو
سچائی اور شانتی کا نڈر پرچارک ہے۔ ہاں، ایک ہی صورت میں وہ تمہارا
خیال شاید چھوڑ دے کہ تمہارے جیسے مسلمان کو وہ مار کر کھوکھلی ہو جائے
گی۔ دوسرے ملکوں میں اُسے مُنہ دکھانے کی جگہ نہ ملے گی، ورنہ مجھے تو
ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ پہلا وار تم پہ ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ نواب منظور
جنگ وغیرہ کا یہ بیان آنے کے بعد پہلے ان نیشنلسٹ مسلمانوں کو راستے سے
ہٹائے، تمہارا نمبر بعد میں آوے"

ہیلڈا جی کی اس بات کے جواب میں شعیب بھائی صرف ایک سُہانی
ہنسی ہنس کر رہ گئے تھے۔

ہائے! دردناک ہمارے اس ڈر کو سچ ثابت کرکے ہمیں کلپانا تھا

نڈر اور بہادر شعیب بھائی طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنے مسلمان مجلسی بھائیوں کے طعنے، گالیاں، دھمکی سبھی کچھ سہتے ہوئے اپنی قلم انصاف، سچائی اور شانتی کے لئے چلاتے ہی رہے۔ انکے رونگٹیں رونگٹیں میں دلتوں اور قوم کی سیوا کا سچا بھاؤ بھرا ہوا تھا۔ اپنے مارے جانے کی بات کو وہ میٹھی مسکان کیساتھ ٹال دیا کرتے تھے۔

× × ×

۲۰ر اگست ۱۹۴۸ء کو شعیب بھائی کو ایک خط ملا، جس میں انکو 'گاندھی کا بیٹا' کی گالی دیکر مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اسی طرح کے خط پہلے بھی کئی بار مل چکے تھے۔ اسی رات کو انکے اخبار 'امروز' کے دفتر میں اسٹیٹ کانگریس کے نیتا اور انکے گہرے دوست شری بی۔ رام کشن راؤ اور ہیلڈا جی سے اس خط کا ذکر ہوا۔ رام کشن راؤ جی نے کہا "شعیب! تم اسے گالی نہیں سمجھ سکتے؟"

جواب میں شعیب بھائی نے کہا "گاندھی جی میرے ہی کیا پورے [illegible] کے پتا تھے۔ [illegible] سے بڑھ کر میری تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں اس کے قابل بنوں"۔ رام کشن راؤ جی انکے اس آخری جملے پر کچھ چونک سے گئے اور بولے "لیکن تم کو سنبھلکر رہنا چاہیئے"۔ لیکن ہونی نے انکے منہ سے کہلوایا۔ "مجھے تو فخر ہوگا اگر میں باپو کیطرح ہی چلا جاؤں"۔

اور [illegible] گھنٹے [illegible] نہ بیت پائے تھے کہ وہ بہادر گاندھی جی کی طرح ہی ہنستے ہنستے چل بسا۔

× × ×

۲۲ر اگست کو 'امروز' کا انک نکلا۔ [illegible] جانے پہلی رات کو اخبار ایڈیٹ

کرتے ہوئے شعیب بھائی کو کیا سوجھا کہ "آج کے لئے خیال" میں انھوں نے مشہور انقلابی شاعر، جوش ملیح آبادی کی نیچے لکھی رُباعی بھی لکھ ڈالی۔

"تقریر کے وقت کیوں نہ بولوں ساقی؟
کیوں دل کی گرہ مے سے نہ کھولوں ساقی؟
برباد تو ہونا ہی ہے بہر حال مجھے
دے جام کہ آباد تو ہولوں ساقی"

نیچے کے دونوں مصرعوں میں تو جیسے اُنھوں نے اپنے دل کی تصویر ہی کھینچ کر رکھدی تھی۔

× × ×

۱۲ر تاریخ کو دو گھنٹے تک میرے گھر پہ ہمیشہ کی طرح آکر بیٹھے حیدرآباد کی حالت پر چرچا چلی۔ ہیلڈا جی نے اُن سے پھر کہا۔ "شعیب صاحب! آپ اپنے لئے سوچئے۔ وہ جگہ بدل ڈالیئے۔ سنبھل کر رہنے میں کیا ہرج ہے؟" لیکن بہادری اور ہمت کا وہ پتلا اپنے وشواس اور اپنے وچار سے ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی اُسی پرانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "جو ہوتا ہے، وہی ہونے دیجئے۔ میری قربانی بھی ہوئی تو وہ خالی نہیں جائیگی۔ ہو جانے دیجئے، جو خدا کو منظور ہے۔"

اسکے بعد دوسری باتیں چھڑ گئیں۔ حیدرآباد کے نمائندوں کا 'یو، این، او' میں جواب دینے کے لئے اُنکو کچھ ساتھیوں کو لیکر پیرس، امریکہ وغیرہ میں جانا چاہیئے، اس مسئلے پر بھی ہم سب نے وچار کیا۔ اُس وقت

کون جانتا تھا کہ یہ ملاقات اور یہ بات چیت بس آخری ہے۔ اور میں ہی کیا جانتی تھی کہ بھائی شعیب اب کبھی اس گھر میں اپنی اس خاص مسکراہٹ کیساتھ "آداب بہن" کہتے ہوئے نہیں آسکیں گے؟

۲۱ تاریخ کو ہم لوگ بے فکری کی نیند سو رہے تھے اور اُدھر رات کو سوا بجے وہ شیر شہید ہو رہا تھا۔ پستول کی گولیوں سے چھاتی اور انتڑیاں چھلنی کی جا رہی تھیں۔ قاسم رضوی کے حکم کی تعمیل ہو رہی تھی، کیونکہ وہ ایک ایسے غدار تھے جنکی ہمیشہ ملک کی بھلائی کے لیے، حیدرآباد میں آصف جاہی جھنڈے کے نیچے سچّے پرجا راج کے لئے اور حیدرآباد کی بھلائی کو خیال میں رکھ کر ہند یونین میں شرکت کرنے کی حمایت میں چلتی رہی تھی۔ صرف دس مہینے ہی تو ہو پائے تھے جب "امروز" روزانہ ہوا تھا۔ لیکن ان دس مہینوں میں ہی شعیب اللہ خاں کی قلم نے مجلسی اور سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچادی تھی۔ انکی قلم میں کچھ ایسا ہی جادو تھا۔

قریب پانچ برس پہلے کی بات ہے، قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ "جو اس وقت اتحاد المسلمین کے صدر تھے" کی موت کے بعد اعلیٰ حضرت نظام صاحب نے مجلس کے اگلے پروگرام اور فرض پر روشنی ڈالنے کے لیے اپنے دستخطوں کے بنا کچھ فرمان نکالنے شروع کئے۔ یہ فرمان صبح دکن اخبار کے اوپر کے بیچ پر موٹے موٹے حروف میں چھپتے تھے۔ حیدرآباد کے نیشنلسٹ مسلمانی حلقوں میں ان فرمانوں کا جواب دینے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟

اُن دنوں بھائی شعیب نے "تاج" نام کے اخبار میں اخبار نویسی کی زندگی شروع ہی کی تھی، اُنھوں نے فوراً ہی کہا: "سچائی کو سامنے رکھنے میں بھی آگا پیچھا سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟" دوسرے ہی دن تاج میں اُن کے نام سے ایک لیکھ چھپا، جس میں بہت ہی صاف لفظوں میں اُنھوں نے اس بات پر کڑی نکتہ چینی کی تھی کہ شاہی فرمان بنا دستخط کے کیوں نکل رہے ہیں اور کیسے نکل سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ کوئی بادشاہ کسی فرقہ پرست سنگٹھن کے جھمیلے میں کیسے پڑ سکتا ہے؟ وغیرہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاج اُسی دن بند کرا دیا گیا اور بھائی شعیب اُسی دن سے حکومت کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھنے لگے تھے۔ پھر "امروز" میں اُنھوں نے دس مہینوں سے جو لیکھ لکھے، اُن لیکھوں نے تو قاسم رضوی اور حکومت دونوں کو ہلا سا دیا تھا۔ اُنکے پیر لڑکھڑانے لگے تھے۔ پھر بھلا رضوی، اتنے بڑے 'غدار' کو کیسے سہن کر سکتا تھا، جسکی قلم اُسکی اندھی عقل کے مطابق 'مملکت آصفیہ' کے خلاف چل رہی تھی!

۱۹ اگست کو تیج ساڑھے دس بجے زمرّد محل ٹاکیز میں ہٹلر کے پاکٹ اڈیشن رضوی نے 'نجات دن' منائے جانے کے سلسلے میں کہا تھا "غدار ہر زمانے میں تھے۔ یہاں اور اس وقت بھی موجود ہیں۔ مجھے اسکی پرواہ نہیں ہے۔ میں ہر اُس ہاتھ کو کاٹ دوں گا، جو 'مملکت آصفیہ' (آصفیہ سامراج) کے خلاف اُٹھے گا..."

ٹھیک ہے، باپو کو بھی تو فرقہ پرست ہندو 'غدار' کہتے تھے اور اسی طرح مارنے کی دھمکی دیتے تھے، کیونکہ باپو انصاف کی بات کہتے تھے۔ لیکن تاناشاہی انصاف کی بات کب پسند کرتی ہے؟

⁂ ⁂ ⁂

رضوی نے جو کچھ کہا، اُسے سچ کرکے بھی دکھا دیا۔ شعیب اور اسماعیل خاں ۱۲ تاریخ کی رات کو آفس سے لوٹ رہے تھے۔ پہلے اُن کو گولیوں کا شکار بنایا گیا اور پھر اُن کا سیدھا ہاتھ اور بایاں ہاتھ کاٹا گیا۔ اسی طرح کا حملہ شعیب بھائی کے سالے اور امروز کے منیجر اسماعیل خاں پر بھی کیا گیا۔ گولی اُنکی بانہہ کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ وہ چلائے "شعیب بھیّا کو مارا جا رہا ہے!" کچھ پڑوسی اور اُنکی بیٹی شور سنکر باہر آئے۔ دیکھ کر وہ چیخیں اور پھر پڑوسی کی مدد سے بھیتر لے جانے لگیں۔ پسلی کے نیچے گولی لگ کر آر پار ہو گئی تھی، ایک گولی چھاتی پر بھی لگی تھی۔ اتنے پر بھی ہمت کا وہ دھنی کچھ قدم پیدل چلا، تین گھر کے پھاٹک کے سامنے آ کر گر گیا۔ آدھی رات میں سنسان سڑک پر نامردوں نے پھر اس بے بس اور گھائل نوجوان پر تلواروں سے وار کیے۔ یہ مذہبی دیوانے سچ مچ ایسے ہی بہادر ہوتے ہیں۔ باپو کے دُبلے پتلے شریر پر گولیاں چلاتے وقت بھی یہ لوگ جیسے بڑی بھاری بہادری سمجھ رہے تھے۔

ہاتھ کٹ چکے تھے۔ ایک بانہہ پر چھ اور دوسری پر چار گہری چوٹیں تھیں۔ سیدھی طرف آدھا سر گھائل تھا۔ کان لٹک پڑا تھا لیکن ہمت نے تب بھی ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

اسی بیچ پڑوسی کی مدد سے ایمبولنس کار آ گئی۔ پولیس بھی آ پہنچی۔ پولیس افسر کو اُنھوں نے اپنا بیان دینا چاہا، لیکن پولیس نے مجسٹریٹ نہ ہونے کا بہانہ کرکے بیان لینے سے انکار کر دیا۔ سازش پوری تھی پھر بھی اُنھوں نے قاتلوں کے نام بتائے، جو شاید اسی محلے کے اور آس

پاس کے تھے۔ چاندنی رات تھی، اسلئے پہچاننا آسان تھا۔

اسپتال میں بوڑھے باپ سے انھوں نے کہا۔ "آپ نے مجھے اکلوتا سمجھ کر پالا تھا (شعیب بھائی اپنے گیارہ بھائی بہنوں میں اکیلے بیٹے تھے) لیکن مجھ میں تو پٹھان کا خون تھا۔ آپ سمجھتے تھے، میرا لال نازک طبیعت کا ہے؟ ابا! میرے چوٹ بہت لگی ہے۔ پیٹ میں سخت درد ہے۔ میرے تین گولیاں لگیں، اتنی چوٹ ہے۔ پر ابا! میں نے اُف تک نہیں کی۔ قاتل بھی سمجھ لیں کہ میں ایک پٹھان تھا..... ابا! فریدہ اور..... کو اپنی بیٹی سمجھنا...... میرا 'امروز' چالو (جاری) رہے........ میرے عزیز (دلہن) کو بلا........"

ٹھیک ساڑھے چار بجے اُس اُنتیس برس کے ہونہار نونہال کو ہم سے ہمیشہ کے لئے موت چھین لے گئی۔ تعجب ہے کہ اتنی سخت چوٹوں کے باوجود وہ تین گھنٹے تک کیسے زندہ رہے اور اتنی باتیں اتنی ہمت کے ساتھ کیسے کہہ سکے؟ ہاں، یہ سب اُس بہادر کی شان میں چار چاند لگانے کے لئے ہوا۔

۲۲ تاریخ کو صبح دل کو بٹھا دینے والی یہ خبر سنی۔ ہم سب اپنا ماتھا ٹھونک کر رہ گئے۔ ہیلڈا بی کے منہ سے نکل پڑا "سب سے بڑی قربانی ہم نے دیدی۔ حیدرآباد کی آزادی اس سے بھی بڑھکر اور کیا قربانی چاہتی ہے؟"

میں فوراً شعیب بھائی کے گھر پہنچی۔ کچھ اور ساتھی اسپتال گئے۔ گھر پر ماں اور بیٹی کا ولاپ اور اسپتال میں بیجان دیہہ کے علاوہ اور کیا ملنے والا تھا۔

* * *

پوسٹ مارٹم وغیرہ کے بعد ساڑھے بارہ بجے لاش گھر پہ لائی گئی۔
لاش پر سے خون سے بھری چادر سرکائی، تو چہرے پر وہی شانتی وہی دھیرج اور ہونٹھوں پر وہی دبی، میٹھی مسکان کھیل رہی تھی۔
تین گھنٹے سے زیادہ اتنی کڑی تکلیفیں سہنے کے بعد بھی اُنکے ماتھے پر ایک سلوٹ تک نہیں تھی۔ سُنا ہے کہ باپو کے چہرے پر بھی تو ایسی ہی شانتی براج رہی تھی۔

بے جان دیہہ کو نہلا دھلا کر کھادی میں لپیٹا اور ڈولے میں رکھ کر باہر لے جایا گیا۔ ہزاروں لوگ آخری درشنوں کو آ رہے تھے اور باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ماں بیہوش سی تھیں۔ اُنکو بڑی مشکل سے گھر سے باہر نکلنے سے روکا گیا۔ پھر بھی وہ پاگلوں کی طرح پوری طاقت سے اپنے کو سب سے چھڑا کر پھاٹک پر آ گئیں۔ ڈولہ موٹر پر رکھا گیا اور جیسے ہی موٹر اسٹارٹ ہوئی، پوری طاقت سے چلائیں "شعیب اللہ خاں زندہ باد"
تمام جنتا نے سسکتی ہوئی آوازوں میں اُن کا ساتھ دیا۔ "شعیب اللہ خاں زندہ باد!"

آہ! شہید شعیب!!

یہ تجھ پر کس کے ہاتھ اُٹھے!!!

(بھائی ہریشچندر ہیلدا)

گزرے دنوں کی پرانی عادت سے بیوفائی کر، حیدرآباد شہر خاموشی کی چادر اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔ آکاش پر تیرتے چاند کی جھلملاتی کرنیں چاندی انڈیل اُسے نہلا رہی تھیں۔ اُس منحوس دن، اگست کی اٹھارہ تاریخ کو رات کے دو بجا چاہتے تھے۔ چاروں اور ہو کا عالم تھا۔ ہر چیز مانو موت کی گود میں اٹوٹ نیند سو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے ساری سرشٹی پر فالج گر گیا ہو۔ زمین و آسمان کا کونہ کونہ خاموش چپ چاپ، بنا ہلے ڈُلے جیسے سجدے میں گرا ہوا تھا۔ لیکن ایک جگہ شاید کوئی چہل پہل ہو۔ وہ جگہ جسے مجاہد اعظم کا سرکاری بڑا دفتر کہتے ہیں۔ اسکی چال تو دنیا سے نرالی ہوگی۔ پر نہیں۔ اوہ! معلوم ہوتا ہے آج چاند کی تنا شیر یکھیرتی چاندنی نے، اُسکے چاروں اور اپنا جادو

ڈال، آخر اسے بھی بے ہوشی کی دوا پلا ہی دی۔ پھر یہ کیا؟ یہ کیسی آواز ہے۔ دارالسلام کے پاس یہ کس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے؟ کوئی قدم بڑھاتا چلا آرہا ہے۔ وہ نزدیک آرہا ہے۔ اب تو کچھ کچھ صاف بھی دکھائی دینے لگا۔ یہ تو کوئی ہاتھوں میں ایک گٹھری اٹھائے ہوئے ہے۔

رات کی دیوی نے اپنا منتر پھونک ساری دنیا کو تو بیکار کر دیا تھا۔ پھر یہ من چلا ہاتھوں میں گٹھری دبائے، جوش کی حالت میں، تیز قدم اٹھاتا آگے ہی آگے چلا آرہا ہے۔ یہ کون ہوگا؟ دھرتی کا چلتا پھرتا کوئی زندہ منش یا کوئی بھوت پریت۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ بری آتمائیں اکیلے میں بھٹکا کرتی ہیں۔ وہ کسی کو اجاڑنے، تباہ برباد کرنے نکلتی ہیں۔ اور کسی پہ بری نیت کر، کسی کی بستی بگاڑنے میں ہی انکو آنند آتا ہے۔ ورنہ اس سنسانے میں اس خوشی سے کون جاتا؟ ..... اوہ! یا خدا!! یہ تو بھوت پریت نہیں ہے، کوئی بڑی تڑپتی ہوئی آتما بھی نہیں، بلکہ یہ تو کوئی سچ مچ ماس اور گوشت پوست کا بنا انسان ہے، جو تیزی سے پھلانگتا، پھاندتا بھاگا چلا آرہا ہے۔ اگر میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے رہیں تو یہ وردی! ..... اس پہ لٹکتی ہوئی یہ بندوق اور تلوار!! یہ کوئی رضاکار تو نہیں؟ رضاکار، جسکے ظلم کے کارنامے سن رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ جسکے جرموں کی کرتوت ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ بالکل وہی معلوم ہوتا ہے۔ آہ! ..... وہی ہے اور کوئی ہو بھی کون سکتا ہے۔ اس اندھیاری جگہ جہاں نہ کوئی قانون چلتا ہے نہ ہی کوئی پوچھنے یا ٹوکنے والا ہے۔ اور کسی کی بھلا کیا ہمت کہ فوجی وردی

پہنے، خوفناک ہتھیار باندھے گھوم پھر سکنے کی سوچے. ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا، یہی رنگ ڈھنگ تو اسکی کالی کرتوتوں میں ایک نئی بات جوڑ دیتے ہیں۔ تو کیا آج کہیں حملہ ہوگا؟ کسی کو لوٹا کھسوٹا جائیگا؟ یا پھر... کسی کی جان لی جائیگی؟ آزاد لوگ، راج کے لئے لڑ رہے، کسی شریف سپاہی کی جیون جیوتی، بجھانے کو یہ آندھی کا سامان تو نہیں اکٹھا کیا جا رہا ہے پر ما تما جانے.... یہ آدھی رات بیتے دارالسلام میں اسے ایسا بھی کیا کام آن پڑا؟ اس گٹھری میں بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ کوئی قیمتی تحفہ یا کوئی .... توڑا ونا ہتھیار. پر نہیں، یہ چیزیں نہیں ہو سکتیں. ان بے رحم ڈاکوؤں کے سردار کے پاس ایسی چیزوں کی کمی نہیں ہے. اب وہ ان کے پیچھے کہاں ٹھوکریں کھاتا ہوگا.

اسکی وردی کہتی ہے کہ یہ تو رضاکار سالار ہے.... تو وہ دروازے کے سامنے ٹھہر گیا. رات کی اس سیاہ تاریکی میں سالار کو خوش خوش آتا دیکھ پہرے والے کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی. سالار کے اندر جاتے ہی اپنے مالک پر نگاہ پڑی. وہ پریشان ہوا. بےچینی سے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹ رہا تھا. کیا وہ اسی ملاقات کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا یا کسی اور ہی دوسری بات پہ جھنجھلا رہا ہے.

سالار کو اسی دم اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

"اللہ اکبر" برکت پور کے رضاکار سالار نے ہاتھ سے سلام ٹھونکتے ہوئے کہا.

کچھ جواب دینے سے پہلے مجاہد اعظم نے سالار پر ایک گہری نظر ڈالی، اور پھر بولا "کہو سالار، آج تم بہت خوش دکھائی دے رہے ہو. یہ تمہارے

ہاتھ میں کیا ہے؟"

"یہ ایک قیمتی تحفہ ہے سرکار، جسے اپنے رہنما کی خدمت میں پیش کرنے کی مجھے عزت مل رہی ہے۔ یہ اس غدّار کا ہاتھ ہے۔ جو کبھی کافر شعیب اللہ خاں کہلاتا تھا۔"

"شعیب!" مجاہد اعظم نے چلّا کر حیرانی سے پوچھا اور اس بنڈل کو لینے کو اُسکے ہاتھ آگے بڑھے۔ اُسکے چہرے سے صاف ٹپکتا تھا کہ اُسے وہ ایک عزّت محسوس کرتا ہے۔ اُس نے سالار کی طرف کچھ اسطرح دیکھا کہ جیسے اتنی بات سے اُس کی ابھی تسلّی نہیں ہوئی۔ اسکے کان ابھی کچھ اور سننا چاہتے ہیں۔

"میں نے پہلے اُس پر گولی چلائی اور پھر اپنی تلوار سے اسکا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ ایک وار میں ہی اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ ساری بات اتنی آسانی سے ہوگئی کہ بچّوں کا کھیل معلوم ہوئی۔ رات کے ایک بجے درخت کے پیچھے چھپ کر، نہتّے آدمی پر نشانہ سادھ دینا کیا مشکل تھا!"

"لیکن تمھیں کچھ دیر تو لگی ہوگی۔ وہ چلایا بھی تو ہوگا!"

"نہیں حضور والا! بالکل نہیں۔ وہ تو ایک ڈھیٹ، منجھا ہوا کافر تھا۔ بچّہ جی چلّا کیسے پاتے۔ اسکے پہلے کہ کوئی آتا، ہم نے جی کھول کر دو، تین، چار، پانچ کیا پورے چھ ہاتھ تلوار کے دیے!"

"اوہ! تو ایسے ہوا۔ کیا وہ اپنے ارادوں میں اتنا بزدل تھا؟"

مجاہد اعظم نے گھبرائی ہوئی آواز میں چلّاتے ہوئے کہا۔ پر اُسے اپنی آواز میں ملی ہوئی گھبراہٹ اکھری۔ اُس نے فوراً ایکانت کے لئے کہا۔

"تم جا سکتے ہو۔ میں بہت خوش ہوں!" یہ شبد اُس نے بڑی مشکل سے کہے۔ اُسے اپنی آواز بے پہچانی معلوم ہوئی۔ اور سالار، وہ خود حیران تھا کہ بات کیا ہے۔

سالار اُس سمے جا چکا تھا۔

"تم کیا سچ مچ خوش ہو؟"

"تم...... تم کون ہو؟"

"تمہاری آتما!"

"کیا تم ابھی تک زندہ ہو؟ جی چاہتا ہے، تمہیں اِسی دم موت کے گھاٹ اُتار دوں!"

"تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ سُنا! ہم دونوں اکٹھے مریں گے۔ خیر چھوڑو۔ یہ تو بتاؤ کہ جو کچھ تمہارے رضاکاروں نے کیا ہے، کیا وہ واقعی جائز اور ٹھیک کیا ہے؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ وہ بہادر ہیں۔ اُنکی رگوں میں جوان خون ہے اور یہ کام اُنکی بہادری کا ایک نمونہ ہے!"

"ایسی بے وقوفی کی باتیں میرے سامنے نہ کرو۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اپنے رضاکاروں کو بہکا سکتے ہو۔ تم انھیں الف لیلہ کی کوئی ایسی کہانی سُنا کر کہ آٹھ رضاکار ہندستانی فوج کے سات سو سپاہیوں سے متواتر سات گھنٹے لڑتے رہے، اپنا اُلو سیدھا کر سکتے ہو، پر مجھے نہیں بہکا سکتے۔ سنو! تم ڈرپوک ہو اور یہ کام بزدلی کا ہے۔ تمہارا رضاکار بھی اِس بات کو مان لے گا کہ اس کام میں تِل بھر بھی اُسے بہادری نہیں دکھانی پڑی۔ اُسے ذرا سرحد تک بھیج کے دیکھو تو

تمھیں سب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائیگا۔ اسکی بہادری جاننا چاہتے ہو تو وہیں پتہ چل جائیگا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ یہ کام نہ صرف ڈرپوکوں کا تھا بلکہ احمقوں کا بھی۔"

مجاہد اعظم کا منہ لٹک گیا۔

"اس بیرحمی کے قتل سے تمھیں کیا فائدہ پہنچا؟"

"مجھے؟ مجھے فائدہ کیوں نہیں پہنچا۔ سنسار سے میرا ایک دشمن اٹھ گیا۔ کیا یہ فائدہ نہیں ہے؟"

"آہا ہا!" آواز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر تمھارا یہی خیال ہے تو تم بچے ہو اور بے وقوف ہو۔ تم یو۔این۔او کے پاس جا رہے ہو۔ تمھارے اسی کام نے تمھارے ننگے روپ میں تمھیں وحشی ثابت کر دیا ہے۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ تم لوگ صرف مذہبی ہلنا تک دیوانے ہو۔"

"یہ غلط ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"تم پر چڑھا مذہبی رنگ تو دیر ہوئی جب ثابت ہو گیا تھا۔ مسلم ریاست اور مسلم حکومت کا نعرہ ہی اس بات کی دلیل ہے۔ اپنے دچاروں سے میل نہ کھانے والی رائے تم دبی زبان سے بھی سننا نہیں چاہتے۔ چاہے وہ کسی مسلمان ہی کی آواز کیوں نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج شعیب شہید نہ ہوتا۔ کیوں؟ اب چپ کیوں ہو گئے؟ یہی ہے تمھارا فاشسٹ کیریکٹر۔ تم مذہبی دیوانے ہو۔ تم متعصب ہو، اسلئے خود نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہو۔ تم پاگل پن سے حکم دینا جانتے ہو اور تمھارے رضاکار آنکھیں اور کان بند کر کے مانتا۔"

"کیا کہا؟ پاگل پن! تم اسے پاگل پن کہتے ہو؟"

"ہاں، میں پاگل پن کہتا ہوں۔ تم مجھے ڈرا اور دھمکا نہیں سکتے۔ میں

بزدل اور کمزور نہیں ہوں۔ تم نے کہا: غداروں کے ہاتھ کاٹ ڈالو، اور کہنے بھر کی دیر تھی کہ تمہارے رضاکاروں نے اس آ گیا کا آنکھیں موند کر پالن کرنا شروع کر دیا۔ کتنے مذہبی اندھے ہو تم اور تمہارے رضاکار۔ تم سوچتے بھی نہیں؟ مجاہدِ اعظم کے پاس اس بات کا جواب کچھ نہ تھا۔

"ذرا سوچو، دنیا کیا کہے گی۔ لوک رائے کو سوچو۔ کیا ان باتوں کے بعد بھی وہ تم سے ہمدردی کریں گے؟ شاید مطلبی لوگ تمہارے حق میں ہو بھی جاتے۔ پر تم اس درجے کے فاشسٹ ہو اور اتنے مذہبی پاگل پن میں رنگے ہوئے ہو کہ وہ لوگ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ یو۔ این۔ او کے ہال بھی تم نے اپنی بازی خود اپنے ہاتھوں الٹ دی۔ تم نے خود مصیبت کو آنے کے لئے دعوت دی ہے۔ ہندستان اپنی فوجیں اب بھیجے گا؟"

"وہ ایسا نہیں کر سکتے!"

"کیوں نہیں کر سکتے؟ جب ریاست میں پرجا کے جان و مال کی حفاظت نہیں ہو رہی تو اس کے سوا اُنکے پاس چارہ ہی کیا ہے؟"

"لیکن میں بنیوں اور برہمنوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں!"

"ہا! ہا! ہا! آ ہا ہا ہا! تو جاؤ، میدانِ جنگ میں جا کر اپنے آپ کو آزما دیکھو۔ تم مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے ہو؟"

مجاہدِ اعظم کے کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ اُسکا چہرہ کالا اور ڈراونا دکھائی دینے لگا۔ ہر گھڑی وہ چہرہ اور بھی بھیانک ہوتا گیا۔ اپنی آتما کی آواز کو کون دیر تک کچل رہ سکتا ہے۔ جیت اُسی کی ہوئی۔ بازی آتما کے ہاتھ رہی۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کتنی دیر تک وہاں ٹہلتا رہا اور چلاتا رہا۔ آتما کا بوجھ اُسے پہاڑ کی طرح محسوس ہوتا تھا اور آخری سمے کا ڈر اُس کے

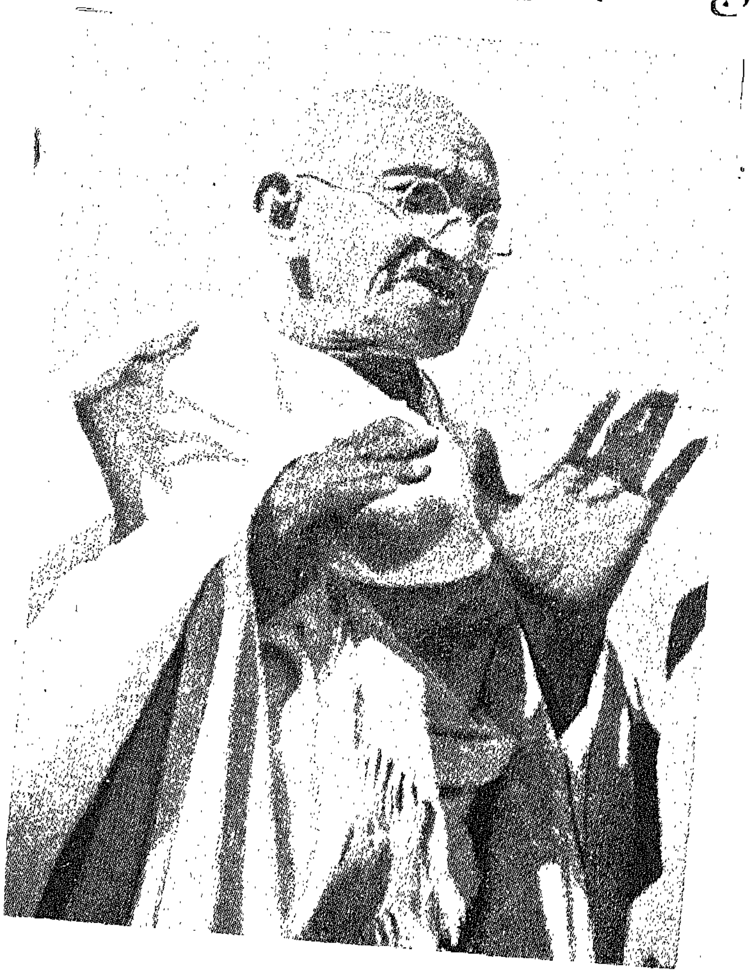
دِل پر بُری طرح چھا گیا تھا۔ پر ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب پہرے دار نے کمرے میں آکر "مجاہدِ اعظم" کہا تو وہ کھینچ کر چیخ اٹھا۔ "نرک میں چلا گیا ہے مجاہدِ اعظم"، اور وہ سنتری تو یہاں تک کہتا ہے کہ اُسکی اپنی آنکھوں کے سامنے سے مجاہدِ اعظم دور پرے ہٹتا گیا، اور دور، اور دور، یہاں تک کہ ہوا کے پردوں میں وہ گھل مل کر اوجھل ہو گیا۔

پھر کیا یہ سچ ہے؟ ہاں سولہ آنے سچ۔ وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے کانوں سے سنیں گے کہ آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ ہی گیا۔ اُس کی آخری منزل یعنی —— جہنّم۔

اور شعیب!
وہ ہر حیدرآبادی کے دل میں ہمیشہ کے لئے اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گیا ہے۔

[انووادک۔ شری جتیندر کرنٹک]

آج کے شہید



باپو

آخری شردھانجلی

[پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ تاریخی بھاشن جو انھوں نے ۱۲ فروری ۴۸ء کو الہ آباد میں سنگم کے کنارے دیا تھا]

آخری سفر ختم ہو گیا ہے اور اس پوتر سفر کی آخری منزل بھی طے ہو چکی ہے۔ دیش کی اس لمبی چوڑی دھرتی پر گاندھی جی پچاس سال تک گھومتے رہے۔ انھوں نے ہمالیہ پردیش، اتری پچھمی سرحدی صوبہ اور اتر پورب میں برہم پتر ندی سے لے کر دکھن میں کنیا کماری تک سفر کیا اور وہ اس دیش کے ایک ایک بھاگ اور ایک ایک کونے میں گئے، ایک یاتری، درسیا ترا کا آنند لینے والے کے روپ میں نہیں بلکہ اس دیش کے نواسیوں کی حالت اور مشکلوں کو سمجھنے اور ان کی سیوا کرنے کے لیے۔ شاید اتہاس کسی ایسے ویکتی کا نام نہیں پیش کر سکتا جس نے گاندھی جی کی طرح اس دیش کے کونے کونے کا سفر کیا ہو، جنتا کی حالت کو ان کی طرح سمجھا ہو اور اُن کی طرح لگاتار سیوا کرتا رہا ہو۔ لیکن اب اس دنیا میں ان کا سفر ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ ہمیں ابھی کچھ دنوں اور سفر کرنا ہے۔ بہت سے

لوگ رنج اور ماتم کر رہے ہیں اور یہ مناسب اور قدرتی بات بھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ہم ماتم کیوں کریں؟ کیا ہم گاندھی جی کا دکھ منا رہے ہیں، یا کسی اور چیز کا؟ اُن کے جیون کی طرح ان کی موت میں بھی ایک ایسی چمک موجود ہے جو آنے والے زمانوں میں صدیوں تک ہمارے دیش کو روشن کرتی رہے گی۔ پھر ہم گاندھی جی کے لیے شوک کیوں منائیں؟ ہمیں تو اپنے لئے رونا چاہیئے۔ اپنی کمزوریوں پر شوک منانا چاہیئے۔ ہمیں اپنی چھاتی تو اپنے دلوں کی سیاہی، اپنے مت بھیدوں اپنے جھگڑوں کے لیے پیٹنی چاہیئے۔ یاد رکھیئے کہ گاندھی نے ہماری انھیں برائیوں کو دور کرنے کے لیے اپنی جان دی ہے اور پچھلے کچھ مہینوں میں انھوں نے پورا دھیان اور ساری شکتی اسی پر لگائی ہے۔ اگر ہم اُن کی عزت کرتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ عزت ان کے نام کی ہونی چاہیئے یا ان سدھانتوں کی جنکی گاندھی جی وکالت کرتے رہے ہیں، ان تعلیموں اور صلاحوں کی جو وہ دیتے رہے ہیں اور خاص طور پر اس بات کی جسکے لیے گاندھی جی نے اپنی جان دی ہے۔

آج گنگا کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹولنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ ہم گاندھی جی کے بتلائے ہوئے راستے پر کہاں تک چلے ہیں اور ہم نے دوسروں کے ساتھ شانتی اور سہیوگ کے ساتھ جیون بتلانے کی کس حد تک کوشش کی ہے؟ اگر آج بھی ہم سیدھا راستہ اپنالیں تو یہ چیز ہمارے دیش کے لیے بہت اچھی ہوگی۔

ہمارے دیش نے ایک مہان انسان کو جنم دیا تھا اور یہ ویکتی ہندستان ہی کیلئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے روشنی کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اُسے ہمارے بھائیوں اور ہمارے دیش واسیوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ آپ کہیں گے کہ یہ ایک پاگل پن کا کام تھا لیکن اس سے اس ورگھٹنا کی

دیا کھیا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ ورگھٹنا صرف اس لیئے ہو سکی کہ اس کا بیج نفرت اور دشمنی کے زہر میں بویا گیا تھا۔ پھر اُس پیڑ کی جڑیں سارے دیش میں پھیل گئیں اور اس سے ہماری قوم کے بے شمار لوگوں پر اثر پڑا۔ اسی بیج سے یہ زہریلا پودا پیدا ہوا۔ اس لیئے ہمارا فرض ہے کہ ہم نفرت اور دشمنی کے اس زہر کا مقابلہ کریں۔ اگر ہم نے گاندھی جی سے کوئی سبق لیا ہے تو ہمیں اپنے دل میں کسی ویکتی کی طرف سے بھی نفرت اور دشمنی نہیں رکھنی چاہیئے۔ ہمارا دشمن کوئی ایک ویکتی نہیں بلکہ ہمارا دشمن تو وہ زہر ہے جو لوگوں کے اندر موجود ہے ہم اسی کا مقابلہ کرتے ہیں اور ہمیں اسی کو ختم کرنا چاہیئے۔ ہم نربل اور کمزور ہیں لیکن ایک حد تک گاندھی جی کی شکتی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئی ہے۔ ان کی جیت اور فتح کی پرچھائیاں ہماری شاریرک شکتی بڑھانے کا کارن بنی ہیں طاقت اور بڑائی انھیں کی تھی اور وہ راستہ بھی، جو انھوں نے ہمیں دکھایا تھا، انھیں کا راستہ تھا۔ ہم اس راستے پر چلتے اور گاندھی جی کی خواہش کے انوسار اپنے دیش واسیوں کی سیوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بار بار ڈگمگائے اور اکثر گر بھی پڑے۔

اب ہماری طاقت کا سہارا موجود نہیں۔ لیکن مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیئے۔ آج یہاں جو دس لاکھ آدمی موجود ہیں ان کے دل میں گاندھی جی کی مورتی رکھی ہوئی ہے اور ہمارے وہ کروڑوں دیش واسی جو یہاں موجود نہیں ہیں انھیں کبھی بھول نہیں سکتے۔ پھر آنے والی وہ پیڑھیاں بھی، جنھوں نے نہ تو انھیں دیکھا ہے اور نہ انھیں دیکھیں گی ان کے بارے میں کچھ سنا ہے، اس مورتی کو اپنے دل میں جگہ دیں گی کیونکہ اب یہ مورتی

ہندستان کی وراثت اور تاریخ کا ایک انش بن گئی ہی۔ آج سے تیس یا
چالیس سال پہلے وہ زمانہ شروع ہوا تھا جسے 'گاندھی یگ' نام سے
یاد کیا جاتا ہی اور آج یہ یگ ختم ہو گیا ..... لیکن نہیں، میں نے یہ
بات غلط کہی ہی کیونکہ یہ یگ ختم نہیں ہوا بلکہ شاید یہ یگ سچے معنی
میں اب شروع ہوا ہی۔ لیکن کسی حد تک بدلے ہوئے روپ میں۔
اُس وقت تک ہم صلاح اور سہایتا کے لئے ان کی طرف دیکھتے رہتے
تھے لیکن اب آگے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور اپنی جان پہ
بھروسہ کرنا پڑے گا۔ ہماری خواہش ہی کہ ان کی یاد ہمارے اندر عمل
کا جذبہ پیدا کرے اور ان کی تعلیم ہمارے راستے کو روشن کرتی رہے
ہمیں اُن کے اس بار بار دئے ہوئے سندیش کو یاد رکھنا چاہیے کہ
اپنے دلوں سے ڈر اور جھگڑے فساد کے بھاؤ کو نکال دو۔ ہنسا کو
ختم کر دو اور آپس کے جھگڑوں کو سدا کے لیے بھلا کر اپنے
دیش کی آزادی کو بنائے رکھو۔

گاندھی جی ہمیں آزادی کی منزل تک لائے اور اس منزل تک
پہنچنے کے لئے جو راستہ اپنایا، دنیا اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لیکن
آزادی ملنے کے بعد اسی چھن ہم نے اپنے گرو کی سکشا کو بھلا دیا۔
حیوانیت اور بربریت کی ایک لہر نے ہمارے قوم پر قابو پا لیا اور
ساری دنیا میں ہندستان کے اجلے اور خوبصورت نام کو بٹہ لگ گیا۔
ہمارے بہت سے نوجوان بہک کر غلط راستے پر پڑ گئے۔ کیا ہمیں
انھیں اپنے دائرے سے نکال دینا یا کچل ڈالنا چاہیئے؟ نہیں! وہ
ہماری ہی قوم کے لوگ ہیں۔ ہمیں ان کے غلط وچاروں کو

بدل کر انھیں صحیح وچاروں کے سانچے میں ڈھا لنا اور اُن کو صحیح شکشا دینی چاہیئے۔

اگر ہم ہوشیار نہ رہے اور ہم نے وقت پر صحیح قدم نہ اٹھایا تو فرقہ پرستی کا وہ زہر، جو ہماری موجودہ تباہی کا کارن بنا ہے، ہماری آزادی ہی کو ختم کر دے گا۔ دو تین ہفتہ پہلے گاندھی جی نے آخری بار جو برت شروع کیا تھا اس کا مقصد یہی تھا کہ ہم غفلت کی نیند سے جاگ کر اُس خطرے کو دیکھ سکیں جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ ان کی اس اپنی مرضی سے کی ہوئی سرفروشی نے قوم کی آتما کو جگا دیا تھا اور ہم نے ان کے سامنے اس بات کا بچن دیا تھا کہ اب ہم اچھے راستے پر چلیں گے اور ہمارے اس یقین دلانے کے بعد ہی وہ برت توڑنے پر راضی ہوئے تھے۔

گاندھی جی ہفتے میں ایک دن خاموش رہا کرتے تھے لیکن اب وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی اور یہ مون سدا کے لئے رہیگا۔ لیکن پھر بھی وہ آواز اس وقت بھی ہمارے کانوں میں آرہی ہے اور ہمارے دل اسے سُن رہے ہیں، ہمارے دیش واسی ہمیشہ دل کے کانوں سے اس آواز کو سنتے رہیں گے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ آواز ہزاروں سال تک ہندستان کی سرحد کے پار بھی گونجتی رہے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ آواز سچائی کی تھی اور اگرچہ کبھی کبھی سچائی کی آواز کو دبا بھی دیا جاتا ہے لیکن اُسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ گاندھی جی کے نزدیک اہنسا سچائی کے اُلٹے روپ کی حیثیت رکھتی تھی اس لئے انھوں نے ہمارے سامنے عملی اہنسا کی ہی نہیں بلکہ دل اور

دماغ میں ہنسا کا خیال لانے کے خلاف بھی پرچار کیا۔ اگر ہم اپنے بیچ ظاہر ہونے والی ہنسا کو بند نہ کر دیں گے، ایک دوسرے کے مقابلے میں انتہائی صبر و برداشت اور دوستی کا ثبوت نہ دیں گے تو ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا بھوشیہ بالکل تاریک ہو جائیگا۔ ہنسا کے راستے میں مصیبتیں ہیں اور جہاں ہنسا کام کرتی ہے وہاں آزادی کی دیوی عام طور سے بہت دنوں تک نہیں ٹکتی۔ اگر ہمارے بیچ ہنسا کا جذبہ اور آپسی جھگڑے موجود ہیں تو سوراجیہ اور جنتا کی آزادی کا ذکر بے معنی بات ہے۔

اس مجمع میں مجھے ہندستانی فوج کے بہت سے سپاہی بھی نظر آرہے ہیں۔ ان کے لئے اس ملک کی سرحدوں اور عزت کی حفاظت کرنا ایک گروہ کا کام ہے۔ لیکن وہ یہ کام اسی وقت کر سکتے ہیں جب وہ ایک ہو کر کام کریں۔ اگر خود ان کے بیچ میں مت بھید پیدا ہو گیا تو پھر ان کی طاقت کی کیا قدر و قیمت باقی رہ سکتی ہے، اور وہ کس طرح اپنے دیش کی سیوا کر سکتے ہیں۔

لوک شاہی آپس میں سنگٹھن، سنیم اور ایک دوسرے کا لحاظ رکھنے کی مانگ کرتی ہے اور آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کی آزادی کا بھی آدر کیا جائے۔ لوک شاہی سرکاروں کے ماتحت جو تبدیلیاں کی جاتی ہیں وہ آپس کی بات چیت اور رضامندی کے طریقے پر کی جاتی ہیں۔ ہنسا کے سادھن استعمال کر کے نہیں کی جاتیں۔ اگر کسی سرکار کو جنتا کی حمایت حاصل نہیں ہوتی تو دوسری سرکار جسے یہ حمایت حاصل ہوتی ہے، اس کی جگہ

بے بستی ہے۔ ہاں کچھ چھوٹی چھوٹی پارٹیاں ہیں، جنھیں جنتا کا سمرتھن اور حمایت حاصل نہیں ہوتی، وہ ہنسا کی کارروائیاں کرنے پر اُتر آتی ہیں اور اپنی حماقت کے کارن یہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لیں گی۔ ان کا یہ خیال صرف غلط ہی نہیں بلکہ بیوقوفی سے بھی بھرا ہوتا ہے کیونکہ ان تھوڑے سے لوگوں کی اس اہنسا کا جس سے وہ زیادہ لوگوں کو ڈرانے کی کوشش کرتی ہیں، یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ زیادہ لوگ بھی جوش میں آکر ہنسا پر اُتر آتے ہیں۔

اس زبردست دُر گھٹنا کے ہونے کا کارن یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے جن میں کچھ بڑی حیثیت کے لوگ بھی ہیں، ہمارے دیش کی ہوا کو زہریلا بنا دیا ہے۔ سرکار اور جنتا کا فرض ہے کہ وہ اس زہر کے اثر کی جڑ تک اکھاڑ کر پھینک دے۔ ہم نے یہ سبق اتنی قیمت ادا کرنے کے بعد حاصل کیا ہے جس کی کلپنا بھی نہیں کی جا سکتی۔ کیا اس وقت بھی یہاں ہمارے بیچ کوئی ایسا دیکتی موجود ہے جو گاندھی جی کے بعد بھی ان کا مشن پورا کرنے کے لئے پرتگیا نہ کرے گا؟ اس مشن کو پورا کرنے کی پرتگیا، جس کے لئے ہمارے دیش کی ہی سب سے بڑی ہستی نہیں بلکہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی نے اپنی جان قربان کر دی۔

آیئے، ہم غرض کہ ہم سب اپنے دیش کی اس پوتر جمنا ندی کے ریتیلے میدان سے اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے، ہمیں تنہائی اور اداسی محسوس ہوگی اور اب ہم پھر کبھی گاندھی جی کو نہ دیکھ سکیں گے۔ جب کبھی ہمارے سامنے کوئی اہم سوال آجاتا تھا، جب کسی معاملے میں کوئی شک وشبہ پیدا ہو جاتا تھا تو ہم صلاح اور رہنمائی حاصل کرنے

کے لیے گاندھی جی کے پاس چلے جاتے تھے، لیکن اب ہمیں صلاح دینے اور ہمارے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے کوئی ہستی موجود نہیں۔ پھر اکیلا میں یا چند لوگ ہی گاندھی جی کی مدد حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس دیش کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں آدمی انھیں اپنا دوست اور صلاح کار سمجھتے تھے۔ ہم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے سامنے ہماری حیثیت بچوں جیسی تھی۔ وہ صحیح طور پر قوم کے باپ کہلاتے تھے اور آج کروڑوں گھروں میں اسی طرح شوک منایا جا رہا ہے جس طرح اپنے پیارے باپ کی موت پر منایا جاتا ہے۔

ہاں، تو ہم ندی کے اس کنارے سے اُداس اور غمگین واپس جائیں گے لیکن ہم اس بات پر فخر بھی کریں گے کہ ہمیں اپنے سردار، اپنے رہنما، اپنے دوست اور اُس مہاپرش کو دیکھنے، اس کے ساتھ رہنے، اس سے بات کرنے اور اسے اس کی آخری منزل تک پہنچانے کا گورو پراپت ہوا ہے جس نے ہماری آزادی اور سچائی کے راستے کی انتہائی اونچائی پر پہنچایا تھا۔ اور جدوجہد کا راستہ بھی جو گاندھی جی نے ہمیں بتایا تھا، سچائی کا ہی راستہ تھا۔ اس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ انھوں نے ہمیں جو راہ دکھائی تھی، وہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر خاموشی کے ساتھ بیٹھنے کی راہ نہیں بلکہ نیکی کے لیے برائی کے ساتھ جنگ کرنے کی راہ تھی۔ اس لئے ہمیں میدان سے بچ نکلنے اور آرام کرنے کی راہیں تلاش کرنے کے بجائے لڑتے رہنا چاہیئے۔ ہمیں اپنا فرض ادا کرنا اور اس عہد کو پورا کرنا ہے جو ہم نے گاندھی جی کے سامنے کیا تھا۔ ہمیں سچائی اور دھرم کے راستے پر چلنا چاہیئے، اور

ہندستان کو ایک ایسا مہان دیش بنا دینا چاہیئے جہاں وشواس اور شانتی کی ہوا موجود ہو اور دھرم و جاتی کے بھید بھاؤ کے بغیر یہ مرد اور عورت عزت اور آزادی کا جیون بتا سکے۔

ہم کتنی بار مہاتما جی کی جے کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور یہ نعرہ لگا کر ہم خیال کر لیتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ گاندھی جی کو اس شور و غل سے ہمیشہ تکلیف محسوس ہوتی تھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ نعرہ بے حقیقت ہے اور کبھی کبھی کام کرنے اور سوچ وچار کرنے کی جگہ بھی نعروں کو ہی دی جاتی تھی۔ مہاتما جی کی جے کا مطلب ہے مہاتما جی کی جیت ہو۔ لیکن ہم گاندھی جی کے لئے کس جیت کی تمنا کر سکتے ہیں؟ انھیں تو زندگی اور موت دونوں میں جیت حاصل ہوئی۔ اب تو آپ کو، مجھے اور اس بدقسمت ملک کو جے حاصل کرنے کے لئے سنگھرش کی ضرورت ہے۔

زندگی بھر گاندھی جی ہندستان کو غریبوں اور دبی کچلی ہوئی جنتا کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ ان کی زندگی کا مشن ان کو اونچا اٹھانا اور آزاد کرانا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو انھیں جیسا بنا لیا اور انھیں جیسا لباس پہننے لگے جس میں کہ ملک سے چھوٹے بڑے کا بھید اٹھ جائے۔ گاندھی جی کی جے کا مطلب دراصل ان لوگوں کی آزادی اور ترقی ہی ہے۔

گاندھی جی ہمارے لئے کس طرح کی جیت اور کامیابی چاہتے تھے؟ وہ جیت اور کامیابی نہیں جسے حاصل کرنے کے لئے بہت سی قومیں اور دیش ہنسا، دھوکا و فریب اور برائیوں کے ذریعے اختیار کر رہے ہیں۔ اس طرح کی جیت ٹکاؤ نہیں ہوتی۔ ٹکاؤ جیت اور جے کی بنیاد تو سچائی کی چٹان پر ہی رکھی

جاسکتی ہے. گاندھی جی نے ہمیں آزادی کی لڑائی کے ڈھنگ، اور ڈپلومیسی کی نئی راہ دکھائی ہے اور انھوں نے راج نیتی میں سچائی، آپس کا وشواس اور اہنسا کا استعمال کرکے دنیا کو اپنے تجربے کی کامیابی دکھلادی ہے. انھوں نے ہمیں سیاسی اور مذہبی وشواسوں کے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہندستانی اور شہری ہونے کے ناتے ہر انسان کی عزت کرنے اور اس کے ساتھ سہیوگ کرنے کا سبق دیا ہے. ہم سب بھارت ماتا کے بیٹے ہیں اور ہمیں اسی دیش میں جینا اور یہیں مرنا ہے. ہم نے جو آزادی حاصل کی ہے اس میں ہم سب برابر کے شریک ہیں اور آزاد ہندستان ترقی کی جو سودھائیں پہنچا سکتا ہے اور آزادی کے کارن جو فائدے ہوسکتے ہیں، ہمارے دیش کے سارے نواسیوں کا ان پر برابر کا حق ہے. گاندھی جی نے کچھ چنے ہوئے لوگوں کے فائدے کے لئے ہی یہ لڑائی نہیں لڑی تھی اور نہ ان کے جان دینے کا مقصد ہی یہ تھا. ہمیں گاندھی جی کے ہی بتلائے ہوئے راستے پر چل کر انھیں کے مقصدوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے. اس سے ہم اپنے کو گاندھی جی کی جے' کا نعرہ لگانے کا سچا ادھیکاری ثابت کرسکیں گے.

گیتا اور قرآن

لیکھک :- پنڈت سندر لال

اس کتاب کے شروع میں دنیا کے سب بڑے دھرموں کی ایکتا کو دکھایا گیا ہے اور سب دھرموں کی کتابوں سے حوالے دے دے کر ملتی جلتی بنیادی سچائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اسکے بعد گیتا کے لکھے جانے کے وقت کی اس دیش کی حالت، گیتا کے بڑپن اور ایک ایک اوصاف کو لیکر گیتا کی تعلیم کو بتلایا گیا ہے۔

آخر میں قرآن سے پہلے عرب کی حالت، قرآن کے بڑپن اور ایک ایک بات پر قرآن کی تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔ اسمیں قرآن کی پانچسو سے اوپر آیتوں کا لفظی ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن میں جہاد، عاقبت، آخرت، جنت، جہنم، کافر وغیرہ کسے کہا گیا ہے۔

جو لوگ سب دھرموں کی ایکتا کو سمجھنا چاہیں یا ہندو دھرم اور اسلام جیسے کی ان دو امرپنتھوں کی سچی جانکاری حاصل کرنا چاہیں انھیں اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔

کتاب ہندستانی زبان میں ناگری اور اردو دونوں لکھاوٹوں میں الگ الگ مل سکتی ہے۔ پونے تین سو صفحے کی سندر جلد بندھی کتاب کی قیمت صرف ڈھائی روپیہ۔ ڈاک خرچ الگ

ملنے کا پتا :- ہندستانی کلچر سوسائٹی، ۴۴ - بائی کا باغ الہ آباد

[illegible]